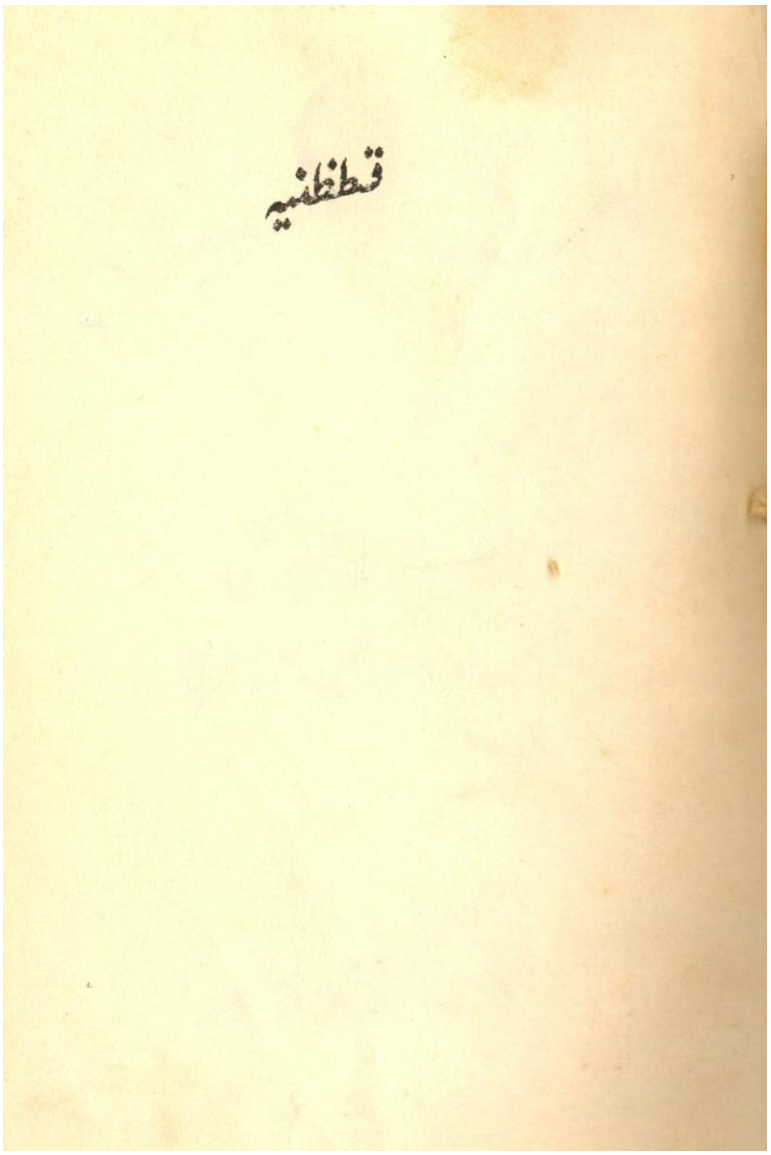

قسطنطنیه

فتح قسطنطنیہ

تصنیف برزڈین کیلٹی

ترجمہ و تتمہ:۔ رئیس احمد جعفری

لاہور اکیڈمی لاہور

This is an authorized translation of
THE FALL OF CONSTANTINOPLE
by Bernardine Kielty.
Copyright, 1957, by Bernardine Kielty.
Published by Random House, Inc., New York.

طبع اوّل ۱۹۶۲ء

تعداد ۱۱۰۰

طابع ایس-ایم-خلل

مطبع مظفر پرنٹرز لاہور

قیمت پانچ روپے

ناشر

لاہور اکیڈمی لاہور

بہ اشتراک

فرینکلن پبلی کیشنز لاہور — نیویارک

عنوانات

	صفحہ
ڈھلتی جھاؤں	۷
ایک ترک غدار	۱۹
ماضی بعید کے دھندلکے میں	۲۷
قسطنطنیہ کا پانی	۳۵
قسطنطنیہ ایک عظیم مملکت	۴۳
حضرت محمدؐ	۵۱
قسطنطنیہ پر مسلمانوں کے حملے	۶۱
قسطنطنیہ کا عہد عروج	۷۷
مسلمان اور عیسائی	۷۴
حروب صلیبیہ	۸۲
چوتھی صلیبی جنگ کی ابتدا	۹۱
دشمن سامنے آتا ہے	۹۹
یونانیوں کی جنگی تیاریاں	۱۱۰

ترکوں کی جنگی تیاریاں	۱۳۲
محاصرہ	۱۴۸
ترکوں کی لرزہ خیز شکست	۱۶۰
مدافعین کا جذبہ دفاع	۱۷۶
زندگی پر موت کو ترجیح	۱۸۸
فتح مُبین	۲۰۱
فاتح، غدار اور شہید وطن	۲۱۴
تتمہ	۲۳۵

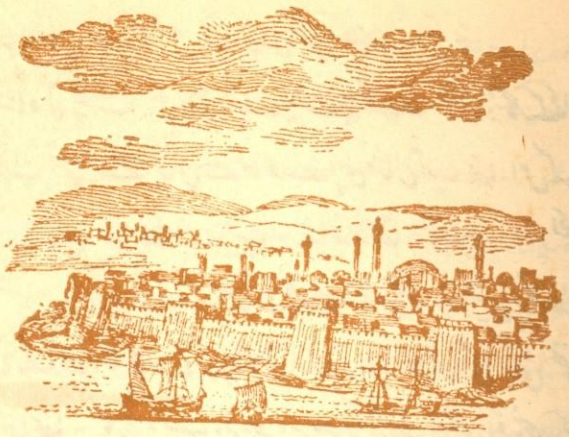

ڈھلتی چھاؤں

شوکت باز نطینی کے ملتے ہوئے نقوش

۲۶ مارچ ۱۴۵۲ء

شہنشاہ قسطنطین یازدہم ملقب بہ پیلیولوگس[1] قصر کے ایک تنگ لیکن شاندار کمرے میں کھڑکی سے لگا سامنے نظر آنے والے مکانات کی چھتوں کو تک رہا تھا، محل کی اس جگہ کا نام کاخ بلاچرنی[2] تھا جو فراز کوہ پر واقع تھا

---

1. CONSTANTINE PALEOLOGUS
2. BLACHERNEA PALACE

یہاں سے شمال مغرب میں قدیم یونانی شہر قسطنطنیہ واقع تھا۔
شہنشاہ کی پشت کی طرف ایک بہت بڑا کمرہ تھا۔ نقش و نگار کے کمال اور تناسب تعمیر کے جمال کے لحاظ سے اپنی مثال آپ تھا۔ اس کمرے کا ساز و سامان نہایت دیدہ زیب اور شاندار تھا۔ سنگی دیواروں پر لٹکے ہوئے مشجر پردے ذرا اونچے اٹھے ہوئے تھے۔ شہ نشین پر تخت شاہی رکھا تھا، تاج زریں جس پر طلائی تاروں سے نقاشی کی گئی تھی پہلے رکھا تھا۔ تاج، تخت، فرنیچر، ہر چیز پر کہنگی طاری تھی، فرنیچر کے مخملی گدے اتنے پرانے ہو چکے تھے کہ جگہ جگہ سے گھس گئے تھے چھت کے شہتیر جو شاہ بلوط کے تھے، دھوئیں سے سیاہ ہو گئے تھے سنگ مرمر کا فرش ناہموار ہو گیا۔ یہ محل سرا کا ایک کمرہ تھا، اس طویل مدت میں اس نے بہت سے عجیب و غریب اور غم انگیز حوادث دیکھے تھے۔
شہنشاہ قسطنطین یازدہم بازنطینی مملکت کا فرماں روا اور کلیسائے شرقی کا سرپرست تھا۔ یہ قسطنطین اعظم نہ تھا۔ لیکن ایک ہزار سال پہلے کے قسطنطین اعظم کا جانشین ضرور تھا۔ یہ یونانی نژاد تھا۔ اس کا نام قسطنطین پیلیولوگس تھا، آنکھیں نیلگوں، چہرہ دلکش، بال گھنگریالے، خوبصورت داڑھی جس کا رنگ بھورا تھا، کہیں کہیں سفید بال بھی جھلک دکھانے لگے تھے۔ اپنے اصل قد سے کچھ لانبا نظر آ رہا تھا۔

کیوں کہ اس کی عبا ٹخنوں تک لٹکی ہوئی تھی، ارغوانی رنگ کا جامۂ شاہی اس کی شخصیت کو نمایاں کیے ہوئے تھا، یہ عبائے زریں، شانے سے لے کر سینے تک سونے کے تاروں سے منقش تھی، جامۂ شاہی کی پرشکوہ سادگی ایک عجیب منظر پیش کر رہی تھی، کلاہِ گوہر دار جس کی نوک آگے کو نکلی ہوئی تھی، زیبِ سر تھا، لیکن پشت کے شاندار کمرے کے کہنہ سامان کی طرح کلاہِ خسروی بھی رعنائی سے محروم نظر آ رہی تھی، ایک گوہر بھی اپنی جگہ سے غائب تھا۔

شہنشاہ لگاتار ٹکٹکی لگائے شہر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پہاڑ کے نیچے مشرقی جانب شاخِ زریں[1] کا ساحل واقع تھا۔ جہاں آفتابِ شام کی ڈھلتی ہوئی روشنی کا عکس بندرگاہ پہ مچلتی ہوئی کشتیوں کے بادبانوں پر پڑ رہا تھا، شاخِ زریں کی آبی تنگنائے میں غلطہ[2] کی پہاڑیاں واقع تھیں، جہاں ایک چھوٹی سی بستی آباد تھی یہاں کے مکانات اپنی مسطح چھتوں اور بلند مینار کے ساتھ صاف نظر آ رہے تھے، غلطہ کی پشت پر تند و جولاں باسفورس بہہ رہا تھا۔ جنوبی اور غربی جانب بحیرۂ مارمورا سرسبز و شاداب جزیروں کے ساتھ نظر کے سامنے تھا، اور آگے چل

---

[1] GOLDON HORN

[2] GALATA

کر شہنشاہ کی حدِ نظر سے دور لیکن بالمقابل بحیرۂ روم[1] اور بحیرۂ ایجین[2] بہہ رہا تھا۔
جو شخص یہاں کے اموال و اوضاع سے واقف نہ ہو یہی سمجھے گا کہ قسطنطنیہ
ایک خوش حال شہر ہے۔ اس کے کلیساؤں کے بلند و بالا گنبد ایک دائمی
وجود نظر آتے تھے۔ خاص طور پر سینٹ صوفیا، جو تمام کلیساؤں میں سب سے
بڑا اور جہانِ مسیحیت میں اپنی شکوہ اور عظمت کے لحاظ سے یکتا تھا، ڈوبتے
ہوئے سورج کی روشنی میں اور زیادہ شاندار نظر آنے لگتا تھا۔ کشتیاں بادِ نسیم
کے جھونکوں کی طرح امواجِ بحر پر رقصاں اور جولاں نظر آتی تھیں، جو تجارتی مال،
اناج، مسالا، پھل اور دوسری ضروریات کی چیزیں مختلف مقامات سے
لا لا کر ڈھیر کیا کرتی تھیں۔ سامانِ تجارت سے لدے ہوئے اونٹوں کے
قافلے غلطہ کی عقبی پہاڑیوں سے ساحل کی طرف رواں دواں نظر آتے تھے۔
ساربان جتنی تیزی سے ممکن ہوتا اونٹوں کو دوڑاتے گذرا کرتے تھے، تاکہ رات
ہونے اور دروازۂ شہر کے بند ہونے سے پہلے پہنچ جائیں اور کارواں
سرائے میں چین کی نیند سوئیں، ان تاجروں اور سوداگروں کے لئے قسطنطنیہ
نمونۂ جنت تھا۔ صحرا اور بیابان کو طے کر کے وہ یہاں آتے تھے، لذیذ کھانوں

---

[1] MEDITERRANEAN SEA

[2] AEGEAN SEA

اور اچھی شرابوں سے لذت اندوز ہو کر فرحت اور انبساط کی گھڑیاں اس پناہ گاہ میں سکھ چین سے بسر کرتے تھے،

لیکن شہنشاہ قسطنطین کی تیوری چڑھی ہوئی تھی، اس کی یہ آشفتہ خاطری کسی ناخوشی اور اضطراب کا نتیجہ تھی۔ اس کا محبوب شہر خطرات میں گھرا ہوا تھا اس کی رعایا پر ایک ایسے دشمن کا خطرہ منڈلا رہا تھا، جو روز بروز قریب سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا، کلیساؤں کے بلند و بالا گنبد جتنے محفوظ نظر آ رہے تھے، کلیسا اتنے ہی غیر محفوظ تھے، شہنشاہ کسی کی آمد کا منتظر تھا، جس کی اطلاعات پر اس امر کا انحصار تھا کہ آیا وقتی طور پر خطرات کے بادل چھٹتے ہیں، یا مصیبت سر پر آن پڑی ہے، اور جو ہو جائے تھوڑا ہے۔

افسردگی کے عالم میں باہر کی دنیا سے جو سورج کی روپہلی روشنی میں نہائی ہوئی تھی، اس نے نظر اٹھائی، اور اپنی پشت کے تاریک کمرے میں پہنچ گیا۔ دو چھوٹی چھوٹی شمعیں اندھیرے سے لڑنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ شہ نشین کے اس حصے پر جہاں مریم عذرا کی ایک تصویر آویزاں تھی، ٹمٹما رہی تھیں۔ یہ تصویر ایک لکڑی کے ٹکڑے پر نقش تھی۔ مریم عذرا کی اس طرح کی تصویر، ہر عیسائی گھر میں، خواہ کسی امیر کا ہو یا غریب کا، آویزاں تھی، گھر کے لوگ جمع ہو کر اس کے سامنے سر نیاز خم کرتے اور دستِ دعا بلند کرتے یہ تصویر اس طرح نظر آ رہی تھی جیسے زمین کی طرف نگاہ جھکائے دیکھ رہی ہو۔

آغوش میں اپنے بچے کو لیے ہوئے جو مشیت الٰہی کا نشان معلوم ہوتا تھا۔
شہنشاہ مریم عذرا کی تصویر کی طرف بڑھا اور اس کے پاس جاکر دوزانو ہوگیا۔ اور لب پر دعا جاری ہوگئی۔ ابھی وہ مصروفِ دعا تھا کہ کسی نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی، وہ تیزی سے اٹھا، شہ نشین پر چڑھا اور تختِ شاہی پر متمکن ہوگیا۔ جب تک وہ شاہانہ شان سے تخت پر نہ بیٹھ گیا اس نے آنے والے کو اندر داخل ہونے کی اجازت نہ دی۔

جامۂ سُرخ میں ملبوس حاجب اندر داخل ہوا اور اندر داخل ہوتے ہی دروازہ بند کرلیا۔ یہ شہنشاہ کا خادمِ خاص بھی تھا، اس کا نام نکولا[1] تھا۔ نکولا نے درباری آداب کے مطابق عرض کیا۔

"پیشکارِ اعظم شرفِ باریابی کے متمنی ہیں!"

یہ سنتے ہی شہنشاہ کا چہرہ دمک اٹھا، تخت اور شہ نشین سے نیچے اترا۔ اور نکولا سے کہا، "حاضر کرو۔"

ارشاد کی تعمیل ہوئی، ایک مردِ کہن سال، جس کے چہرے سے دانشمندی اور فراست کے آثار نمایاں تھے، حاضر ہوگیا۔ یہ فرانزا[2] تھا۔ منصب

---

[1] NICHOLAS

[2] PHARANZA

کے اعتبار سے پیشکار اعظم اور حکومت کے خفیہ خارجی امور کا سربراہ۔
فرانزا اور شہنشاہ ایک دوسرے سے تپاک اور گرم جوشی کے ساتھ
ملے۔ شہنشاہ نے کہا، "میں تخت پر بیٹھا جس شخص کا انتظار کر رہا تھا، وہ تم
تو نہ تھے!" پھر سنجیدگی اور ثقاہت کو بالائے طاق رکھ کر اس نے ایک
قہقہہ لگایا، ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے فرانزا کو دیکھ کر شہنشاہ کا سارا تکدر
دور ہو گیا۔ ان دونوں کی ملاقات ایک شہنشاہ اور وفادار خادم کی نہ تھی، دو
پرانے دوستوں کی تھی۔
فرانزا ابھی حال ہی میں مختلف ممالک کا سفر کر کے دو سال کے بعد واپس
آیا تھا۔ سفر کا مقصد یہ تھا کہ مشرقی یورپ کے شاہی خانوادوں میں کوئی
موزوں شاہزادی، رفیقۂ حیات کی حیثیت سے شہنشاہ کے لئے منتخب
کرے۔ مصارفِ سفر اور ضروری اخراجات کے سلسلے میں جملہ وسائل دولت
اس کے تصرف میں دے دیئے گئے تھے۔ جہازوں کا ایک بیڑا اور شاہانِ
یورپ کے لئے گراں بہا تحائف سے لدی پھندی کشتیاں ساتھ لے کر
فرانزا روانہ ہوا تھا۔ اس قافلے کا دل بہلانے کے لئے سازندوں اور سرود
نوازوں کا ایک طائفہ بھی موجود تھا۔ دنیا کے سب سے بڑے شہر، قسطنطنیہ
اور بہت بڑی مملکت کی ثروتِ بے حساب دیکھ کر، بلقان، روس
اور گرجستان کے اشراف و اعیان کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔

فرائزا کے ساتھ طبیبوں اور پادریوں کی بھی ایک جماعت تھی ۔ دو سال تک
فرائزا نے بحیرہ مارمورا[1] کی لہروں پر اپنا سفر جاری رکھا ۔ اس اثناء میں
بہت سی بندرگاہوں پر لنگر انداز ہوا ۔ آخر میں باسفورس سے بحیرۂ اسود[2]
ہوتا ہوا اس سرزمین پر پہنچا، جہاں وہ گوہر مقصود مل گیا، جس کی تلاش تھی،
یہ گرجستانی شہزادی تھی، اس کی آنکھیں سیاہ تھیں، یہ ایک زوال رسیدہ دیار
خاندان کا گوہر شب تاب تھی، یہ خاندان کلیسائے یونان سے رشتۂ عقیدت
بھی رکھتا تھا، مریم عذرا کی جس تصویر کے سامنے ابھی شہنشاہ دوزانو ہوا تھا
اس کے سامنے یہ خاندان بھی محو نیائش و عبادت ہوا کرتا تھا ۔ شہزادی کے
والد نے جہیز بسیار کے علاوہ بہت بڑی تعداد میں دلاوروں اور سورماؤں
کے دستے بھی شہنشاہ کی امداد و اعانت کے لئے بھیجنے کا وعدہ کیا تھا ۔
عہد نامے پر دستخط ہو چکے تھے، سارے امور تکمیل پا چکے تھے، چند ماہ
بعد شاہ بانو باسفورس کے راستے قسطنطنیہ وارد ہونے والی تھی ۔
گو سفر سے واپسی کے بعد فرائزا شہنشاہ سے کئی بار مل چکا تھا، لیکن
ہر ملاقات کے موقع پر شہنشاہ جوش مسرت سے بے قابو ہو کر یوں محو

---

[1] MARMORA

[2] BLACK SEA

کرتا جیسے پہلی بار ملنا ہوا ہے، اس نے کہا، "فرانزا، تم سے اتنے دنوں کی جدائی میں نے کیسے برداشت کر لی؟" فرانزا نے جواب دیا، اس دوری کے باوجود ہم دونوں ایک ہی مقصد کے حصول کے لئے سرگرم کار تھے، میرے آقا!"

شہنشاہ نے فرانزا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا، "کیا واقعی وہ مبارک عہد پورا ہونے کا وقت آگیا، جب شہزادی باہزاراں شکوہ و جلال اس دیار کے ساحل پر آکر اترے گی؟"

فرانزا نے سر کی جنبش سے اقرار کیا، جس میں ہمدردی بھی جھلک رہی تھی۔

یہ قسطنطین یازدہم گو شہنشاہ تھا لیکن شاہانہ ہیبت و جلالت اس میں کہاں تھی؟ یہ مصیبتوں خطروں اور پریشانیوں میں گھرا ہوا تھا، تاریخ اس کے بعض فیصلوں کے درست اور نادرست ہونے کے بارے میں شبہ کر سکتی ہے، گو لوگوں کے دل زندگی کے حوصلوں سے معمور تھے۔ لیکن ہمارے شہر میں کوئی فرد ایسا نہ تھا جو اپنے کو مامون و محفوظ سمجھتا ہو، بایں ہمہ یہ امر واقعہ تھا، کہ شہنشاہ ایک جیالا شخص تھا ـــــ اور وفادار دوست بھی۔

صرف فرانزا ہی ایک ایسا شخص تھا جس سے شہنشاہ کھلے دل سے باتیں کر سکتا تھا۔ "تم واحد شخص ہو" شہنشاہ نے بلوقار لہجے میں کہا "جس سے

میں بے پردہ گفتگو کر سکتا ہوں، میں مشتبہ اور ناقابلِ اعتماد لوگوں میں گھرا ہوا ہوں، درباری سخت خودسر اور ناقابلِ اعتماد بن چکے ہیں، خاص طور پر ایک شخص ا۔

فرانز نے عارفانہ انداز میں سر ہلایا، گویا وہ اس شخص کو جانتا ہے شہنشاہ نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا، "میری موجودگی میں وہ اس بات سے اتفاق کر لیتا ہے جو میرے منہ سے نکلے، لیکن میرے سامنے سے ہٹتے ہی مخالفت کرنے لگتا ہے، میں نہ اس سے نزاع کر سکتا ہوں نہ بحث کیونکہ جب آمنا سامنا ہوتا ہے تو وہ اس حقیقت ہی سے انکار کر دیتا ہے کہ ہمارے درمیان کچھ اختلاف بھی ہیں۔ فرانز سمجھ گیا کہ شہنشاہ گرینڈ ڈیوک لوکاس نوٹرس کے بارے میں گفتگو کر رہا ہے، جو شاہی بیڑے کا امیر البحر تھا اور بہت بڑا دولت مند، مرتبے کے لحاظ سے شہنشاہ کے بعد اسی کا درجہ تھا، شہنشاہ نے کہا،

"پیشوایانِ کلیسا تک میرے خلاف ہو گئے ہیں، وہ کہتے پھرتے ہیں کہ میں ملک کا وفادار نہیں ہوں! میں"۔ شہنشاہ نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ دونوں خاموش تھے دونوں کے خیالات تاریک نامعلوم مستقبل پر مرکوز

ا GRAND DUKE LUCAS NOTEROS

تھے۔

آخر شہنشاہ نے گفتگو کا موضوع بدلا، اپنے یار وفادار کو خوش کرنے کے لئے اس نے اپنے سفری پروگرام پر جو عنقریب پیش آنے والا تھا۔ گفتگو شروع کر دی، کہ پہلے وہ شاہزادی کو لے کر آئے، پھر یورپ کے سفر پر نکلے گا، اور وہاں کے بادشاہوں سے پیمان دوستی استوار کرے گا۔

فرانزا ہنس پڑا اس نے کہا، ارشاد ہمایونی کے سامنے مجال دم زدن کسے ہے، لیکن اگر ایک مرتبہ دو سال کے لئے پھر سفر پر جانا پڑا تو میری بیوی یا تو کوئی دوسرا شوہر کرلے گی یا راہبہ بن جائے گی۔

شہنشاہ نے اسے یقین دلایا کہ ممالک خارجہ کی طرف یہ اس کا آخری سفر ہوگا۔ اس نے کہا، "واپسی پر مملکت کا سب سے بڑا منصب تمہارے لئے چشم براہ ہوگا۔ باقی رہا تمہارا لڑکا تو اس کی عمر چودہ سال سے زیادہ نہیں، میں نے اس کے لئے ایک ایسی لڑکی منتخب کر لی ہے جسے اپنے باپ سے ترکے میں دولت فراواں ملے گی۔

فرانزا نے اظہار سپاس گزاری کے طور پر سر جھکا دیا لیکن خاموش رہا جو اندیشے دل میں پرورش پا رہے تھے، انہیں زبان پر نہیں لا سکتا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ یہ سفر اسے نہیں اس کے بیٹے کو کرنا چاہیے

ایک مرتبہ باز نطینی سلطنت کے حدود سے اُس کے قدم نکل جانے کے بعد خواہ نخواہ اپنی نامراد اور دولت مند بیوی کے ساتھ، ان دونوں کو وہیں رہنا ہوگا کہ آنے والے خطرات سے محفوظ رہیں۔ باقی رہا میں، خود تو میں اپنے آقائے ولی نعمت کے دامن سے اندوہ و مصیبت کے ان ایام میں وابستہ رہوں گا۔

آخر کار شہنشاہ کا یہ پیش کار اعظم اور عزیز دوست جب رخصت ہوا تو رات اپنا ڈیرا ڈال چکی تھی، اور گھروں کی روشنی نیچے سطح سمندر میں نور افشانی کر رہی تھی۔

ایک مرتبہ پھر شہنشاہ کسی آنے والے کے انتظار میں چشم شوق بن کر بیٹھ گیا۔

ایک ترک غدّار

"وزیر اعظم خلیل پاشا" ——— نکولا نے یہ آواز لگائی اور شہنشاہ کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔

جیسا کہ نکولا اچھی طرح جانتا تھا، خلیل پاشا، سلطان محمد ثانی کے محکمہ امور خارجہ کا سربراہ بھی تھا، ساتھ ساتھ ایک نئی ابھرتی ہوئی بااقبال مسلمان ترک حکومت کا وزیر اعظم بھی تھا۔ یہ قوم آہستہ آہستہ گہرے سیاہ بادل

کی طرح ایک خطرہ بن کر قسطنطنیہ پر منڈلانے لگی تھی۔

نکولا نے اپنے آقائے ولی نعمت پر اضطراب سے بھری ہوئی ایک نظر ڈالی۔

قسطنطین نے سر کا اشارہ کیا، شہنشاہ اور حاجب کے درمیان شاذ و نادر ہی گفتگو ہوتی تھی، لیکن دونوں کے درمیان اعتماد اور تفاہم کا رشتہ مضبوطی سے قائم تھا۔ شہنشاہ کی پرشکوہ اور تحکمانہ آواز شاندار لیکن نیم آراستہ کمرے میں گونجی۔

"وزیر اعظم کو پیش کیا جائے"

اس اثناء میں کہ نکولا جائے اور خلیل پاشا کو لے کر آئے۔ شہنشاہ ایک مرتبہ پھر مریم عذرا کی تصویر کے پاس آ کھڑا ہوا، سینہ پر صلیب کا نشان بنایا اور پھر شہ نشین پر چڑھ کر تخت شاہی پر جلوہ افروز ہو گیا۔ دو شمع بردار خادم آگے آگے نمودار ہوئے اور ان کے پیچھے فراخ عبا، جس پر زردوزی کا کام کیا ہوا تھا، پہنے اور سفید دستار زیب سر کئے شہنشاہ کا ملاقاتی آ رہا تھا۔

"میرے آقا" اتنا کہہ کر اس نے شہنشاہ کے سامنے سر خم کیا، اس کی سیاہ اور تیز آنکھیں سامنے کی دیوار پر لٹکی ہوئی تصویر پر جمی تھیں۔

"ہم بالکل تنہا ہیں"۔ شہنشاہ نے خلیل پاشا کو یقین دلایا اور اسے یقین کر لینا پڑا۔

وزیر اعظم خلیل پاشا شہنشاہ کا پسندیدہ شخص تھا۔ یہ ادھیڑ عمر کا ایک آدمی تھا۔ رنگت سانولی، لبیں کتری ہوئی، لمبی اور باریک ناک، دست و پاسبک، اس کا لباس شہنشاہ کے جامۂ ارغوانی سے زیادہ بیش قیمت تھا۔ کمر سے شمشیر خمدار لٹکی ہوئی تھی، جو چاندی کے میان میں رکھی تھی، کانوں میں سونے کے دو حلقے (بالے) لٹکے ہوئے تھے، پاؤں میں نرم و نازک جوتی، جس کی خم کھائی ہوئی نوک اوپر اٹھی ہوئی تھی۔

یہ دونوں ایک دوسرے کو گزشتہ ایک سال کی مدت سے جانتے تھے۔ یہ ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے اور ایک دوسرے پر اتنا ہی اعتماد کرتے تھے جتنا دو مختلف تہذیبوں اور دو مختلف مذہبوں کے افراد کر سکتے ہیں۔

شہنشاہ جانتا تھا کہ اندرونی حالات یعنی ضعف سلطنت سے وہ آگاہ ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ عہد کر لے کہ اس بد قسمت اور متزلزل ملک کے وسائل اور ذرائع جہاں تک ساتھ دیں گے انعام کی بڑی بڑی رقمیں ادا کرنے میں کوتاہی نہیں کرے گا، اسے اس شخص پر جو اس وقت اس کے سامنے حاضر تھا اُسے بہت زیادہ اعتماد تھا، یہ شخص اس سے قبل کئی مرتبہ اپنے آپ کو عیسائیوں کا دوست ثابت کر چکا تھا اور جو رقمیں یہ وصول کرتا رہا تھا، اس کے بدلے میں اس نے نمایاں خدمات بھی انجام

ہیں۔ شہنشاہ کے لئے سب سے زیادہ مسرت بخش اور باعث اطمینان بات یہ تھی کہ خلیل پاشا اب تک سلطان محمد کا وزیر اعظم تھا۔

شہنشاہ افسردہ نظروں سے دولتِ عثمانیہ کے وزیر اعظم کی سیاہ اور درخشاں آنکھوں کی طرف اس طرح تک رہا تھا جیسے کہنا چاہتا ہو "خلیل پاشا بتاؤ کیا کہنا چاہتے ہو؟"

خلیل پاشا نے سوچا زبان پر صلح کے الفاظ ہیں اور دل میں جنگ کرنے کا ولولہ! اس نے کسی کا نام نہیں لیا، لیکن قسطنطین سمجھ گیا کہ یہ سلطان محمد ثانی کا ذکر ہو رہا ہے۔

خلیل پاشا نے سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا، وہ فاتح ہے اور جوان ہے، کوئی قانون اسے پابند نہیں کر سکتا، کوئی رکاوٹ اس کے بڑھتے ہوئے قدم نہیں روک سکتی، جو پیمان اس کے مقصد میں مانع ہو وہ ٹوٹ جائے گا اگر آپ اس کے مقابلے سے بچ جائیں تو خدا کا شکر بجا لائیے۔

شہنشاہ نے خشم آلود اور برہم لہجے میں سوال کیا "تم چاہتے ہو کہ میں قسطنطنیہ چھوڑ دوں؟"

خلیل پاشا نے ملائمت سے جواب دیا، "سلطان محمد تیزی سے حرکت کر رہا ہے، وہ استحکامات کی تیاری میں شب و روز مصروف ہے، کئی کشتیاں کاریگروں اور کارکنوں سے لدی پھندی باسفورس کی طرف بڑھ

رہی ہیں۔ وہ خود ایک لشکر گراں کے ساتھ ایڈریانوپل[1] سے روانہ ہو کر عنقریب ان لوگوں سے آملے گا۔" اس نے باسفورس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، "بائیں جانب کی طرف جو حصار ہے اسے متوازن کرنے کے لئے داہنی طرف کے ساحل پر بھی حصار تیار ہو جائے گا۔ وہاں سے چھ میل کے فاصلے پر ہمارا قیام ہوگا، ایک کے بجائے دو حلقے اس جگہ کی حفاظت کریں گے، جہاں دونوں ساحل قریب تر ہو جاتے ہیں، ہزاروں معمار روانہ ہو چکے ہیں۔ ہر معمار کے ساتھ چار مددگار اور بے شمار مزدور ہیں۔"

شہنشاہ نے اپنے نشانوں کو جنبش دی۔

"میرا آقا اہل قسطنطنیہ کو بھوکا مار دینا چاہتا ہے۔" خلیل پاشا نے کہا۔

"قسطنطنیہ کے باشندے کبھی بھوکے نہیں مریں گے۔ ہمارے پاس غذا کا جو ذخیرہ ہے وہ لاکھوں آدمیوں کو شکم سیر کر سکتا ہے۔" شہنشاہ نے کہا۔

کوئی کشتی بان سلطان محمد کی بنائی ہوئی تنگ گذرگاہ سے گذرنے کی

---

[1] ADRIANOPLE

جرأت نہیں کر سکتا۔ پھر آپ روس سے گندم اور قفقاز سے گوسفند کس طرح حاصل کر سکتے ہیں؟ قسطنطنیہ کے انبار خانے کتنے آدمیوں کا پیٹ بھر سکیں گے؟" خلیل پاشا نے پوچھا۔

"تقریباً دو لاکھ نفوس کی شکم پری کے لئے غلہ موجود ہے۔" شہنشاہ نے نخوت اور تکبر کے ساتھ کہا۔

"کتنے ہفتے اور کتنے مہینے آپ دو لاکھ آدمیوں کا پیٹ بھر سکیں گے؟" خلیل پاشا نے سوال کیا۔

"جب تک ہم تمہارے سلطان کو ختم نہ کر دیں" شہنشاہ کی آواز میں جوش کے باعث ارتعاش پیدا ہو گیا۔ اس نے کہا۔ "جب تک تمہارے سلطان کو ایک مرتبہ پھر اناطولیہ کے دشت و بیابان میں بکریوں اور گھوڑوں کے گلوں کے ساتھ روانہ نہ کر دیں۔ نہیں بلکہ جب تک تمہارے سلطان کو ایشیا کے انہیں بیابانوں میں واپس نہ کر دیں جہاں سے اس کے اجداد آئے تھے"

خلیل پاشا کے چہرے پر تلخی کے آثار نمایاں ہوئے۔ غصہ کے باعث نہیں، بلکہ اس وجہ سے کہ اس عیسائی کے الفاظ میں جو ہٹ دھرمی جھلک رہی تھی اُسے محسوس کر رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے آقائے ولی نعمت کے عزم اور جرأت سے بھی اچھی طرح واقف تھا۔

خلیل پاشا خود بھی بزدل نہیں تھا۔ اس نے کہا،

"چھ مہینے ہوئے مَیں نے آپ کو بتایا تھا کیا ہونے والا ہے۔ اور اس وقت کا انتباہ آج واقعہ کی صورت میں نظر کے سامنے ہے، میرے دوست اب مَیں بے بس ہُوں کچھ نہیں کر سکتا۔" خلیل پاشا نے سنجیدگی اور افسردگی کے ساتھ کہا، "اور واقعہ یہ ہے کہ میری حیثیت چشمے میں بہتے ہوئے ایک سنگ ریزے کی ہے، عیسائیوں کے دوست کی حیثیت سے مَیں بدنام ہو چکا ہوں، کوئی نہیں جانتا میرا انجام کیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے میری زندگی ختم کر دی جائے، یہ بھی ممکن ہے کہ آقائے ولی نعمت کے لئے فی الحال میرا زندہ رہنا زیادہ سود مند ہو، کیونکہ اگر مَیں مر گیا تو میرے ساتھ وہ معلومات بھی ختم جائیں گی، جو عیسائیوں کے بارے میں مجھ سے متوقع ہیں، مَیں آپ سے صرف یہ کہنے آیا ہُوں کہ اگر آپ کی دلیری اور شجاعت شہر چھوڑ دینے کی اجازت نہیں دیتی تو پھر جنگ کی تیاری کیجئے، زیادہ سے زیادہ چھ مہینے کی مدت اور باقی ہے اس کے بعد جنگ کی بجلی چمکے گی، اور آپ کے شہر پر گر رہے گی۔

خلیل پاشا چلا گیا، شہنشاہ ایک مرتبہ پھر کھڑکی سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اور باہر کی طرف دیکھنے لگا۔ مکانات کی کھڑکیوں سے روشنی اس طرح نظر آ رہی تھی جیسے ستارے آسمان سے زمین پر اتر آئے ہیں۔ قصر کے نیچے کسی کے گانے کی آواز آئی، نہ جانے یہ آواز کسی کشتی بان کی تھی جو دور دراز کا سفر طے کر کے ساحل پر واپس آیا تھا اور اب جوش و مسرت سے مجبور ہو کر نغمہ سرائی کر

رہا تھا، یا پھر شراب خانے سے نکلے ہوئے کسی مست الست کا نغمۂ
بے ہنگام تھا۔

ماضی بعید کے دھندلکے میں

قسطنطین اعظم کے عہد اور موجودہ شہنشاہ قسطنطین یا دہم پیلیو لوگس کے عہد میں جو قصر بلاچرنی کی گیلری میں کھڑا تھا، ایک ہزار سال سے زیادہ کی مدت گزر چکی تھی۔

قسطنطین اعظم کے عہد کی عظیم اور وسیع مملکت صرف اس شہر تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ جس کے ایک قصر میں شہنشاہ قسطنطین پیلیولوگس کھڑا

ہوا سامنے کی پہاڑی کی طرف تک رہا تھا۔

وہ مملکت جس کا پایۂ تخت قسطنطنیہ تھا، ایک زمانے میں اٹلی سے لے کر ایشیا میں دریائے فرات کے دہانے تک، وسطی یورپ میں دریائے ڈینیوب سے لے کر افریقہ میں دریائے نیل کے آبشاروں تک پھیلی ہوئی تھی، اور اب یہ تنگ کوچوں، شاندار کلیساؤں اور عالی شان محلات اور دوکانات کے ایک مثلث تک محدود ہو کر رہ گئی تھی جس کے باشندوں کی تعداد خلیل پاشا کے سامنے شہنشاہ کے بلند بانگ دعووں کے علی الرغم ایک لاکھ سے زیادہ نہ تھی۔

بازنطینی مملکت مختصر ہو کر ایک شہر قسطنطنیہ میں سمٹ آئی تھی، یہ شہر گیارہ سو سال سے حوادث کے تھپیڑے کھاتا اور زمانے کے وار سہتا جئے جا رہا تھا، اپنی محکم اور مستحکم فصیل کے اندر یہ اب بھی سربلند اور عظیم تھا۔

قسطنطنیہ دنیا کے چار بڑے شہروں میں سے ایک تھا۔

مسیحیانِ یورپ کے شیوۂ زندگی اور فکر و روح پر ایتھنز، روم اور یروشلم کے علاوہ جس شہر نے گہرا اثر ڈالا تھا، وہ قسطنطنیہ تھا۔ اگر قسطنطنیہ نہ ہوتا تو رومن لا بھی نہ ہوتا۔ یونان کے آثار ہنر بھی مفقود ہوتے، بلکہ شاید مسیحیت کا وجود بھی نہ ہوتا، یہ تمام چیزیں مسلسل گیارہ صدیوں تک مشرق کے

اسی مضبوط قلعے میں محفوظ رہیں۔

بہت سے موثرات اور عوامل تھے، جنہوں نے قسطنطنیہ کی اس اہمیت کو فروغ بخشا ـــــ محل وقوع، آب و ہوا اور تین سمندروں کا مقام اتصال۔

قسطنطنیہ ایک مثلث ہے، جو دو طرف سے پانی سے گھرا ہوا ہے شمال مغرب میں مشہور، لمبی، اور خم کھائی ہوئی بندرگاہ، شاخ زریں ہے جنوب مغرب میں بحیرۂ مارمورا واقع ہے اور ان دونوں کے مابین بحیرہ باسفورس ہے جو شمال سے تیز رو دریا کی طرح تندی اور تیزی کے ساتھ بہتا ہے۔

لیکن قسطنطنیہ کے استحکامات میں صرف آبی راستے ہی شامل نہیں تھے خشکی کی طرف سے بھی، قدرتی قلعہ بندیاں موجود تھیں۔

وہاں کا موسم نہ بہت زیادہ گرم ہے، نہ غیر معمولی سرد، موسم گرما میں وہاں شمال کی ہوائیں خنکی پیدا کر دیتی ہیں اور موسم سرما میں جنوبی ریگستانوں کی گرم ہوائیں، موسم کو گرم کر دیتی ہیں، وہاں کی تغیر پذیر فضا اطراف بحر روم کے شہروں سے کہیں زیادہ خنک ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہاں کے لوگ زیادہ چوکس، زیادہ مصروف زیادہ خلاق ہوتے ہیں۔

تو یہ ہے قسطنطنیہ کی وضع طبیعی،

اس شہر کی تاریخ ۳۳۰ء سے شروع ہوتی ہے۔ جب قسطنطین اعظم

شہنشاہ روم نے، اپنے اوج عظمت واقتدار کے زمانے میں اسے مملکت روم کا مشرقی پائے تخت قرار دیا۔

لیکن اس سے پہلے بھی یہ شہر ایک تاریخ رکھتا تھا۔!

قسطنطین اعظم سے بہت پہلے ایک چھوٹا سا شہر جسے لوگ بازنطیم[1] کے نام سے یاد کرتے تھے، اسی مثلث پر آباد تھا، کس طرح یہ شہر تعمیر ہوا، اور کس نے اس کی بنیاد ڈالی؟ یہ عہد قبل از تاریخ کا قصہ ہے، جس کا سراغ نہیں لگ سکتا، بہرحال یہ امر واقعہ ہے کہ جب تاریخ کا آغاز ہوا تو یہ چھوٹا سا محفوظ و مضبوط شہر مذکورہ مثلث کے راس پر موجود تھا۔ یہاں یونانی بت پرست رہتے تھے اپنے آبی راستوں کے باعث اس نے تجارتی بندرگاہ کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔

لیکن عہد کہن میں دنیا امن وامان کی نعمت سے کم بہرہ ور ہوتی تھی، ان صدیوں میں بازنطینی قوم مختلف فاتحین زیر نگیں رہی، کبھی ایران نے فتح کر لیا، کبھی یونانیوں نے ایرانیوں کو مار بھگایا، اور پھر سے خود قابض ہو گئے۔ اس قدیم زمانے میں ایک شخصیت بہت نمایاں نظر آتی ہے۔ یہ فلپ[2] مقدونی ہے۔ اس جواں سال اور جواں بخت تاجدار کی حریصانہ نظریں

---

[1] BY ZANTIUM

[2] PHILIP OF MACEDONIA

بازنطیم پر پڑنے لگیں۔

اس زمانے میں جنگ بہت معمولی سی چیز تھی، اس نے طے کر لیا کہ اچانک حملہ کر کے اس شہر پر قبضہ کر لے گا، وہ کسی تاریک اور طوفانی رات کا انتظار کرنے لگا اور ایک شب جب وہاں کے لوگ خواب خرگوش میں مبتلا تھے، موسلا دھار بارش ہو رہی تھی، اور تند و تیز ہواؤں کے جھکڑ چل رہے تھے، فلپ کی فوج بازنطیم پر حملہ آور ہوئی۔ یہ سپاہی فصیل کی دیواروں پر چڑھ گیے اور زیر زمین خفیہ راستوں سے ہوتے ہوئے خاموش اور سنسان گلیوں اور کوچوں میں داخل ہو گیے۔

ناگہاں ہوا نے رخ بدلا، بادل پھٹ گیے، اور چاند چمکنے لگا۔ چاندنی اتنی تیز اور غیر متوقع تھی کہ سڑکوں کے کتے بھونکنے لگے۔ بے ہنگام غوغائے سگاں سے باشندگان شہر بھی جاگ اٹھے۔ انہیں دشمن کی چال معلوم ہو گئی فوراً مسلح ہو کر نکل پڑے، صبح ہوتے ہوتے وہ تمام مقدونی سپاہی جو داخل شہر ہو چکے تھے، ذبح کر دئے گیے۔ باقی اپنے ساتھیوں کا یہ انجام دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

بازنطینیوں نے اس فتح کو دیوتاؤں کا ایک معجزہ قرار دیا، اور اسی دن سے ماہ نو کو، کہ یہی ان کی فتح کا سبب تھا ایک لازوال حیثیت دینے لگے، ان کے سکوں پر ماہِ نو منقش ہوا، پرچم پر اس کی تصویر ابھری، چاند

اور تارے شہر باز نطیم کی علامت و نشان بن گیے، اور آج بھی قسطنطنیہ کے آخری فاتحوں ——— مسلمانوں ——— کے پرچم پر یہ نشان باقی ہے۔

جب روم دنیا پر حکومت کر رہا تھا، باز نطیم اس کا اتحادی بن گیا۔ یہ تدبیر بڑی کارگر ثابت ہوئی۔ اس کی آزادی قائم رہی اور کرۂ ارض کی سب سے بڑی اور طاقتور مملکت کا اتحادی ہونے کے باعث اس کی سلامتی اور زیادہ مستحکم ہو گئی۔

لیکن روم کی سیاست پیچیدہ اور الجھی ہوئی تھی۔ دور دراز فاصلے کے باعث دونوں میں اتحاد باقی نہ رہا۔ باز نطینی لوگوں نے کئی غلطیاں کیں اور ایک غلطی تو اتنی بڑی تھی کہ وہ آغاز بھی ثابت ہوئی اور انجام بھی۔

چوتھی صدی عیسوی میں دو رومن شہنشاہ ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوئے۔ یہ جنگ شہنشاہ لائی سینیس[1] فرمانروائے مشرقی روم اور شہنشاہ قسطنطین فرمانروائے غربی روم میں ہوئی۔ اس جنگ میں باز نطینی بھی شریک ہو گیے۔ لائی سینیس ایک پرانا مستبد حکمران تھا۔ قسطنطین جوان اور جاہ طلب تھا، ساتھ ہی ساتھ ماہر فنونِ جنگ بھی۔ باز نطینیوں نے پورے جوش و خروش کے ساتھ لائی سینیس کا ساتھ دیا۔

---

[1] LICINUS

یہ دونوں شہنشاہ چاہتے تو باسانی سلطنت روم کو آپس میں تقسیم کر لیتے اور امن و امان کی زندگی بسر کرتے اور تقریباً نو سال تک ایسا ہوا بھی۔

لیکن قسطنطین ایک مہم پسند شخص تھا، وہ ڈینیوب کے قریب ایک ایسی جگہ پیدا ہوا تھا جہاں نہ کاشت اور زراعت تھی، نہ سکون و آسودگی، یہی وجہ ہے کہ حد درجہ جوشیلا اور لڑاکا تھا۔ برطانیہ بھی جو خود وحشیانہ زندگی بسر کر رہا تھا، اس کے زیر نگیں تھا، جہاں وہ قیصر کے لقب سے حکومت کرتا تھا۔ اس نے یورپ کے وحشیوں پر فتح حاصل کر لی تھی، روم کو فتح کر لیا تھا اور اب امن و امان کی زندگی کا جویا تھا، لیکن روم میں نہیں، کیونکہ اس کے نزدیک یہ شہر حد سے زیادہ متمدن ہو چکا تھا، اس لئے مائل بہ زوال تھا۔ جب اس کی نظر باز نطیم پر گئی تو اس نے محسوس کیا کہ ہر مقصود ہاتھ آگیا جیسے بے ساختہ کہہ اٹھا۔

"انسانی ہاتھوں نے اس سے اچھا اور خوبصورت شہر کوئی اور نہیں تعمیر کیا ہے، نہ فطرت نے کسی دوسرے شہر کو یہ کمالات بخشے ہیں۔"

اپنی لشکر کشی اور جنگ جوئی کے زمانے میں اس نے بہت سے شہر دیکھے تھے، لیکن کیا کوئی باز نطیم جیسا بھی تھا؟ ———— ہرگز نہیں۔

لیکن اس شہر پر قبضہ کر لینا ہنسی کھیل نہیں تھا۔ اس شہر نے طویل عرصے

کی صعوبتیں اتنی دلیری اور ہمت سے برداشت کیں، کہ محاصرہ کرنے والا خود محصورین کو داد دینے اور ان کی تحسین کرنے پر مجبور ہو گیا۔

اس نے جنگ جیتنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ آخر کار شہنشاہ لائی سینیس نے ہتھیار ڈال دیے، اور گرفتاری کے بعد موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

قسطنطین نے یہ سوچ کر کہ فتح ہر حیثیت سے مکمل ہونی چاہیے لائی سینیس کے بے گناہ بیٹے کو بھی قتل کر دیا۔

قسطنطنیہ کا بانی
قسطنطین اعظم

اب قسطنطین سلطنتِ روما کا تنہا فرماں روا تھا، اس نے شہر بازنطیم پر ۳۲۴ء میں قبضہ کر لیا، ۳۳۰ء میں اسے اپنا پائے تخت قرار دیا، اس کی آرزو تھی کہ اسے دنیا کا سب سے بڑا شہر بنا دے، اور بالآخر یہ خواب پورا ہوا۔

سب سے پہلے اس نے یہ کام کیا کہ چھوٹی ٹسی پٹی کے بجائے پورے

مثلث کو شامل کرلیا ۔ ساتھ ہی ساتھ آس پاس کی پہاڑیوں کو بھی شامل کرکے وہاں فلک بوس عمارتوں کی طرح ڈالی، مملکت کی ساری دولت و ثروت مشرق کے اس پایۂ تخت میں کھنچ آئی، دنیا جہان کی قیمتی چیزوں کا یہ شہر مرکز بن گیا، مختلف جزائر سے سنگِ مرمر، قدیم یونان کی کارگاہوں سے خوبصورت اور دیدہ زیب مجسمے، معابد سے نفیس ستون اور عمدہ عمدہ کتبے، اونچے اونچے زنگار رنگ سنگی تراشے، یہ تمام چیزیں اپنے اپنے مرکز اور معدن سے اس نئے شہر میں پہنچ رہی تھیں، فتح و نصرت کی یادگار محرابیں کئی جگہ نصب کی گئیں، فصیل تعمیر ہوئی، سربفلک پھاٹک بنائے گئے، آبِ مصفا کی چھوٹی چھوٹی نہریں زرِ کثیر صرف کرکے کھودی گئیں، روم کی ساری دولت شہنشاہ کے تصرف میں تھی، غلاموں کی بے شمار قطاریں شب و روز مصروفِ کار رہتی تھیں، قسطنطین نے عظیم و پرشکوہ تعمیرات کا ایسا شاندار پروگرام بنایا اور اسے روبہ عمل لایا کہ سرعتِ عمل اور صرفِ مال کے لحاظ سے دنیا اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے ۔

اربابِ دولت و ثروت کو جوں ہی ان حالات سے آگاہی ہوئی تو نوبت یہ پہنچی کہ روم اور دوسرے شہروں کی اقامت ترک کرکے لوگ جوق در جوق اپنے متعلقین و متوسلین کے قافلے اور زر و مال سے لدی ہوئی کشتیاں لے کر اس شہرِ نو کی طرف بڑھنے لگے، نہایت مختصر مدت میں چار سو عظیم الشان قصر تعمیر

ہو گیے، ڈیڑھ سو سے زیادہ حمام بن گیے۔ اور پھر بہت جلد یہاں کی آبادی روم سے بڑھ گئی۔

مرکز شہر میں ایک بہت بڑا میدان تھا، تمام اہم تقریبات اور اجتماعات یہیں منعقد ہوتے تھے، کشتیاں ہوتیں، اسپ رانی ہوتی، میدانِ جنگ سے آئے ہوئے بہادروں کا یہیں استقبال کیا جاتا، فوجی نمائش کا یہیں اہتمام ہوتا، پھر یہیں مجرموں کو سزائیں دی جاتیں، باغیوں اور گنہگاروں کو موت کی سزا ملتی۔ یہ میدان طرب گاہ بھی تھا اور الم کدہ بھی، یہ میدان پہلے بھی تماشا اور اب قسطنطین نے تزئینات فراواں اور وسعت بے اندازہ سے اس کی ہیئت ہی بدل دی۔

نگاہ تصور سے ذرا اس میدان کو ایک مرتبہ دیکھئے جو وسط شہر میں تقریباً بیضوی ایکڑ زمین پر پھیلا ہوا تھا، اس کے بیچ میں مصر سے لایا ہوا، چوپھل سنگی ستون سر اٹھائے کھڑا تھا، یہ اب تک موجود ہے، اور سر سے پر تخت شاہی کی جگہ تھی، بعض دوسرے گوشوں میں عجیب و غریب اور عظیم الجثہ مجسمے نصب تھے، ایک مجسمہ ایک زن عظیم پیکر کا تھا، جو ایک ہاتھ میں گھوڑا اور سوار تھامے ہوئے تھی، ہرکیولیز[1] کا مجسمہ اتنا بڑا کہ ایک دراز قامت شخص کا سر اس کے گھٹنوں تک آتا تھا۔ ایک عظیم الجثہ ہاتھی کا خشمگین مجسمہ تھا، ہیلن[2] کا مجسمہ

---

[1] HERCULES

[2] HELEN

بھی تھا۔ جس کی داستانِ پیرس[1] اور مینیلے اس مشہور ہے، آٹھ مجسمے ابوالہول[2] کے تھے، گرگِ مادہ اور چرخ کا ایک مجسمہ تھا، یہی جگہ تھی جہاں بعد میں ایک مشتعل انبوہ نے ایک غدار شہنشاہ کا سر قلم کیا تھا،

بہر حال یہ جو کچھ بیان ہوا، اس عظیم اور نئے شہر کا فن کامل نہیں تھا، اسے ہنر کے نام سے صرف یاد کیا جا سکتا ہے لیکن اس زمانے میں اس نے دنیا کو انگشت بدنداں کر دیا تھا، جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا، شہر میں مجسموں کی تعداد بڑھتی گئی، یہاں تک کہ ایک دن آگیا کہ تعداد میں مجسمے شاید شہر کی آبادی سے بھی کچھ بڑھ گیے بلکہ شاید یہ غلط نہ ہو کہ ان مرمریں اور برنجی مجسموں کا ایک نیا شہر نمودار ہو گیا۔

اس میدان میں نصب چار زریں گھوڑوں کا مشہور مجسمہ آج بھی وینس میں سینٹ[3] مارک کے بڑے گرجے کے صدر دروازے پر موجود ہے، اسے تیرہویں صدی میں وینسی لیٹرے قسطنطنیہ سے چرا کر لائے تھے۔

---

[1] ہیلن سپارٹا کے بادشاہ مینلے اس کی بیوی تھی، جسے پیرس نے اغوا کر لیا تھا اور اپنے ساتھ ٹرائے لے گیا تھا۔ مینلے اس نے اپنی بیوی واپس لینے کے لئے ٹرائے پر لشکر کشی کی۔ یہیں سے اس افسانے کو فروغ حاصل ہوا۔ (مترجم)

[2] SPHINXES [3] ST MARKS CATHEDRAL

۱۱ مئی ۳۳۰ء کو جب شہر کو پائے تخت قرار دینے کی تقریب منعقد ہوئی تو ایک بہت بڑا جلوس نئی بنی ہوئی سڑکوں سے گزرتا ہوا اس میدان میں آیا۔ شمالی کنارے پر رکھے ہوئے تخت شاہی پر متمکن شہنشاہ اس مجمع کو دیکھ رہا تھا، جو آج کی یادگار اور ناقابل فراموش تقریب کا تماشائی بن کر آیا تھا، اور سراپا حیرت و مسرت بنا کھڑا تھا۔ شہنشاہ کے گرد اس کے عزیزوں اور رشتے داروں کی صفیں تھیں، البتہ اس موقع پر شہنشاہ کی ملکہ فاسٹا[1] موجود نہیں تھی، کیونکہ شہنشاہ نے اسے حمام میں قتل کرا دیا تھا۔ شہنشاہ کا بڑا بیٹا کرسپس[2] بھی موجود نہ تھا، اسے بھی خفیہ طور پر ہلاک کر دیا تھا۔ شہنشاہ کی والدہ سینٹ ہیلنا[3] بھی موجود نہ تھی، کیونکہ کچھ عرصہ ہوا وہ بھی طبعی موت مر چکی تھی۔ تمام دوسرے جیتے جاگتے ہوشیار اور آئندہ مند شہزادے موجود تھے، جو یہ نہیں جانتے تھے کہ شہنشاہ کی موت کے بعد وہ ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہوں گے اور بدترین دشمن کی طرح ایک دوسرے کی جان کے گاہک بن جائیں گے۔ خاندان شاہی کے گرد و روم کے اکابر، اشراف اور مختلف ممالک کے

---

[1] TAUSTA

[2] CRISPUS

[3] ST. HELENA

سر براہ موجود تھے، یہ سب لباس فاخرہ میں ملبوس تھے۔ اس کے بعد کچھ اعیان وامراءِ شہر کی نشستیں تھیں، میدان میں عوام کا ہجوم غل مچا رہا تھا۔

قسطنطنیہ کو پایۂ تخت قرار دینے کا یہ جشن پورے چالیس دن تک جاری رہا۔

قسطنطین اعظم روم کا پہلا مسیحی شہنشاہ تھا، کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ خواب میں اس نے صلیب آتشیں[1] آسمان پر معلق دیکھی، جس پر روشن الفاظ میں یہ مرقوم تھا۔

"اس نشان کے سائے میں آگے بڑھ اور فتح کر" یہ نشان دیکھتے ہی وہ عیسائی ہو گیا۔

قسطنطین کا ایمان مسیحیت پر کتنا راسخ تھا؟ اور اس کے عیسائی ہونے کی داستان کہاں تک سچ ہے؟ یہ ہمارا موضوع نہیں، چوتھی صدی عیسوی کے آغاز میں رومن امپائر کے اندر عیسائیوں کی تعداد بہت کم تھی۔ لیکن یہ چھوٹی سی جماعت اتنی منظم اور متحد تھی کہ جس کسی کے ساتھ بھی ہو جاتی اس کے لئے بڑی کارآمد ثابت ہو سکتی تھی، قسطنطین کا باپ کانسٹینٹیس[2] عیسائیوں پر

---

[1] یورپ میں رواج تھا کہ اعلانِ جہاد کے لئے صلیب کو جلا کر خون میں بجھاتے تھے اور اسے قریہ بہ قریہ گھما کر لوگوں کو تیار کرتے تھے ایسی صلیب آتشیں صلیب کہلاتی تھی۔ (مترجم)

[2] CONSTANTIUS

مہربان تھا۔ اور انہیں قدر و قیمت کی نگاہ سے دیکھا کرتا تھا، اور مختلف طریقوں سے انہیں نوازا کرتا، اور مال و زر سے ان کی مدد کیا کرتا تھا، اور خود یہ قسطنطین عیسائی بننے سے پہلے بھی، عیسائیوں کا محافظ اور سرپرست تھا۔ وہ ان کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کرتا تھا، تبلیغ دین عیسوی کی انہیں اجازت دے رکھی تھی، وہ ان کا پشت پناہ تھا۔ جب مملکت کے ایک شہر کے باشندوں نے بت پرستوں کے معابد توڑ پھوڑ ڈالے تو اس نے اس شہر کو سزاوار انعام قرار دیا۔

قرین قیاس یہ ہے کہ قسطنطین اعظم نے محسوس کر لیا تھا، کہ مستقبل کا مذہب عیسائیت ہے، رہی یہ بات کہ اس نے دین عیسوی کو مصلحۃً قبول کیا، یا آسمانی نشان دیکھ کر یا اپنے کارنامہ ہائے زشت سے شرمسار و تائب ہو کر یہ کوئی نہیں جانتا، لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ اس کا دور تاریخ مسیحیت کے لیے ایک موڑ کی حیثیت رکھتا ہے، بہت سے اشراف و اعیان اس کی دیکھا دیکھی مسیحی ہو گیے۔ خاندان کا جب کوئی بزرگ دین عیسوی قبول کرتا تو اس کے متعلقین و متوسلین بھی یہ مذہب اختیار کر لیتے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک سال کے اندر روم کے بارہ ہزار افراد مسیحی ہو گیے، قسطنطنیہ کو یہ فخر حاصل تھا کہ یہاں کبھی بت پرستی نہیں ہوئی۔

سپاہی سوداگر اور پیشہ ور لوگ انجیل کے روایات و تعلیمات اپنے ساتھ

لے کر، قسطنطنیہ سے باہر نکلے، بہت تھوڑے عرصے میں یورپ کے وحشی اور درندہ خو باشندوں نے بھی مسیحیت اختیار کر لی۔
یہ مذہب ان کے لئے اس وجہ سے اور زیادہ قابلِ قبول تھا کہ دنیا کی سب سے بڑی مہذب اور طاقتور مملکت اور اس کے جلیل فرماں روا کا مذہب تھا اور وہ اس کی تبلیغ و اشاعت میں بہ نفس نفیس دلچسپی لے رہا تھا۔

قسطنطین اعظم کو اس دنیا سے رخت سفر باندھے ایک ہزار سال سے زیادہ کی مدت گزر چکی ہے، اور قسطنطین یازدہم اپنے سنسان قصر بلاچرنی کے ایک گوشے میں تصویر یاس و الم بنا کھڑا تھا، ان دونوں شہنشاہوں ——— جن میں سے ایک نے اس عظیم مملکت کا سنگ بنیاد رکھا، اور دوسرے کے ہاتھوں یہ ختم ہونے والی تھی ——— کی رگوں میں جو خون گردش کر رہا تھا، ایک نہ تھا، ان میں مشترک صرف مذہب اور نام کا تھا، ان دونوں کے درمیان گزرنے والی صدیوں میں یہ شہر پہلے مسیحی شہر کی حیثیت سے ترقی کر کے دنیا کا سب سے بڑا اور مضبوط مسیحی شہر بن گیا تھا، اور اب ———؟

قسطنطنیہ — ایک عظیم مملکت

جسٹینین اعظم اور ملکہ تھیوڈورا

گیارہ سو سال تک قسطنطنیہ مشرقی رومن امپائر کا پائے تخت رہا۔ ہر غیر عیسائی قوم کے خلاف ایک مستقل محاذ۔ صدیوں پر پھیلی ہوئی اس طویل مدت میں گیارہ سلسلے، گیارہ بڑے خاندان کچھ دانشمندی اور نیکی کے ساتھ، کچھ بدی اور ستمگری کے ساتھ حکمران رہے — لیکن ان فرماں رواؤں کی

کمزوریاں اور معصیت کوشیاں قوم کی سالمیت اور عظمت پر اثر انداز نہ ہو سکیں تاجدار آئے اور گئے لیکن باشندگان قسطنطنیہ اپنی جگہ قائم اور ثابت رہے۔

شاید نامناسب نہ ہو، اگر ہم چند قدم پیچھے ہٹ کر تاریخ کی روشنی میں ان چہروں کو دیکھنے کی کوشش کریں۔ جو ماضی کے غبار تاریک میں بھی درخشاں نظر آتے ہیں، اور جو حوادث اور جو معرکہ آرائیاں ان کی رہین منت ہیں، ایک نظر ان پر بھی ڈال لیں۔

قسطنطنیہ کی تاریخ میں سب سے زیادہ مصروف و یگانہ ہستی شہنشاہ جسٹینین[1] اعظم کی گزری ہے۔ اس کا دورِ حکومت ۵۲۷ء سے ۵۶۵ء تک ہے۔

آج کل یورپ اور آج کا جہانِ عیسائیت اب تک "ضابطۂ جسٹینین" سے وابستہ اور متاثر ہے۔ جسٹینین نے قانون اور نظم مملکت کی باقاعدہ تعلیم و تربیت حاصل کی، اس کا سب سے بڑا اور دقیع کارنامہ یہ ہے کہ اس نے رومن قوانین پر نظر ثانی کی اور انہیں زیادہ سادہ اور عام فہم کر دیا، کیونکہ یہ قوانین حد درجہ پیچیدہ تھے، اس نے متروک اور بے تکے قوانین کو چھانٹ دیا، اور جنہیں باقی رکھا، انہیں عام فہم بنا دیا۔ یہ ایک بہت بڑا کارنامہ تھا جس کی

---

[1] JUSTINIAN THE GREAT

قدیم واقعی اس عہد کے لوگ تو نہ کر سکے لیکن بعد میں آنے والی نسلوں نے اس کی عظمت و اہمیت کو محسوس کیا اور اس کے باعث اسے شہنشاہ عظیم و جلیل کی حیثیت سے یاد رکھا،

جسٹینین کا دوسرا بہت بڑا کارنامہ کلیسائے سانتا صوفیا کی تعمیر ہے، اس کا عظیم الشان گنبد آج بھی اس شہر کو چار چاند لگائے ہوئے ہے، یہ عظیم گنبد زمین سے ایک سو اسّی فٹ اونچا ہے۔ یہ اس کمال سے اپنے پایوں پر استوار ہے کہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے جنبش میں ہے۔ جسٹینین کے زمانے میں سنہرے اور جواہر گوں رنگ سے پوری داستانِ مسیحیت یہاں منقش تھی، یہاں کے مرمریں ستون بہت سی خوبصورت محرابوں کو اٹھائے ہوئے تھے، ان پر سونے اور چاندی کی پچی کاری کی ہوئی تھی، جس سے ان میں عجیب طرح کی چمک پیدا ہو گئی تھی، جب کلیسائے سانتا صوفیا کی تعمیر مکمل ہو گئی تو جسٹینین فخر اور نخوت کے ساتھ پکار اٹھا تھا!

"سلیمان! میں تجھ سے بازی لے گیا ——————"

اس عجیب و غریب تعمیری کارنامے کو جسٹینین کے ہم عصروں نے بھی خوب سراہا، دور دراز مقامات سے لوگ اس نادرۂ روزگار عمارت کی زیارت کرنے آیا کرتے تھے، مردانِ شہر کا بھی ہر وقت زیارت اور عبادت کے لئے ہجوم رہتا تھا۔

جسٹینین نے مملکت کی زبان یونانی قرار دی، لاطینی فراموش کر دی گئی اس شہر کی صناعی، اس کا طرزِ تعمیر، اس کے رسوم و رواج، مغرب و مشرق کے رسوم و عادات اور طرز و ہنر سے ممتاز تھے، اس کے "آرٹ" کا طرزِ سبک ——— بلکہ اس کا شیوۂ زندگی تک رفتہ رفتہ جداگانہ طور پر مشخص ہونے لگا۔ یعنی بازنطینی کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ کچھ اس لئے کہ یونان قدیم سے امتیاز ہو سکے، اور کچھ اپنے مخصوص صفات کے باعث۔

جسٹینین کی شہرت جس طرح اس کے کارناموں پر مبنی ہے اسی طرح اس میں اس کی ملکہ کا بھی حصہ ہے۔

"ضابطۂ جسٹینین" ——— سانتا صوفیا ——— اور ——— تھیوڈورا[1]۔

یہ ملکہ تھیوڈورا جسے جسٹینین نے شریک تاج و تخت بنا لیا تھا، قسطنطنیہ کے ایک نہایت غریب گھرانے کی لڑکی تھی اس کا باپ خرس بان تھا اور یہ ایک کارنیوال میں مزاحیہ کام کرتی تھی، یہ گالوں کو پھلا کر آنکھوں کے ڈھیلے اس طرح پھراتی تھی کہ دیکھنے والے بے ساختہ قہقہے لگانے اور تالیاں بجانے

---

[1] THEODORA

لگتے، اس کی ایک اور بہت بڑی خصوصیت یہ تھی کہ بے انتہا خوبصورت تھی، اس کی تصویریں اور مرقعے اب تک موجود ہیں، جن سے ہم بڑی آسانی کے ساتھ اس کے خدوخال اور اس کی زیبائی صورت اور چشم کشش انگیز دام ناز کی فتنہ سامانیوں کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

ان تمام خصوصیات وصفات پر مستزاد وہ حد درجہ ہوشمند وزیرک بھی تھی۔ جب نوجوان جسٹینین نے اسے دیکھا تو پہلی ہی نظر میں دل کے ساتھ حواس بھی کھو بیٹھا اور ایک مرتبہ دام محبت میں رسید ہونے کے بعد پھر اپنے آپ کو سلامت نہ لے جا سکا، اور وہ خود اس دام سے نکلنا بھی نہیں چاہتا تھا تھیوڈورا بیس سال تک نہایت شوکت وقوت کے ساتھ اس کی شریک تاج وتخت رہی، اور اس ساری مدت میں وہ اس کا وفادار رہا اور دیوانہ وار محبت کرتا رہا۔

جسٹینین کے دور حکومت میں جہاں نعمتیں ارزاں ہوئیں اور مُن برسا، وہاں بلائیں اور آفتیں بھی آئیں۔

زلزلے کے جھٹکے چالیس شبانہ روز قسطنطنیہ کو زیر وزبر کرتے رہے اس حادثے میں تقریباً ڈھائی لاکھ آدمی ہلاک ہوئے۔

آسمان پر کئی مرتبہ دُمدار ستارے دیکھے گئے، اور لوگ لرز اٹھے، کیونکہ اس زمانے میں وہ نجوم سے واقفیت نہ رکھتے تھے۔

جسٹینین کے دور حکومت کے پندرہویں سال میں دنیا کے سب سے بڑے طاعون نے ڈیرہ ڈال لیا۔ یہ طاعون گھومتا پھرتا معتدل ممالک میں وارد ہوا پھر نقل وطن، سیر و سیاحت اور جنگ کے سلسلے میں مختلف مقامات کے لوگوں کے میل جول سے ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ٹیکہ ایجاد نہ ہوا تھا، بیماری جنگل کی آگ کی طرح بڑھتی اور پھیلتی تھی، یہ طاعون باون سال تک جاری رہا۔ شہر کے شہر صاف ہو گیے، قسطنطنیہ میں ہر روز ہزاروں آدمی مرنے لگے، بہت سے لاوارث اور غریب افراد کی لاشیں جو دفن نہ ہو سکیں کوچوں اور گزرگاہوں پر پڑی رہیں۔

بایں ہمہ قسطنطنیہ عروج اور فروغ کی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مشرق سے سامان تجارت لادے ہوئے قافلوں پر قافلے چلے آرہے تھے، یورپ سے جہازوں کے بیڑے اسباب زندگی سے بھرپور آآ کر لنگر انداز ہو رہے تھے، اپنے شاندار کلیساؤں اور اپنے شہنشاہوں کے فلک رفعت محلات و قصور کے باعث قسطنطنیہ دنیا کا پائے تخت بن گیا تھا۔ کتب خانوں میں ادبیات یونان قدیم زندہ و تابندہ موجود تھیں، پہاڑوں کے اس خطے میں جہاں کی مرطوب آب و ہوا میں ایک ایسی قوم پل رہی تھی، جو زندگی اور امنگ سے معمور تھی، جس نے یونانی تمدن کو دوام بخشا۔

یہ شہنشاہ بڑے جابر اور مستبد تھے، ان میں شاید کوئی بھی ستمگری اور سنگ دلی سے خالی نہ تھا، لیکن مردمانِ شہر کا تحمل، ثبات قدم اور استقلال انہیں ہر مشکل سے سلامت نکال لے جاتا تھا، جیسا کہ قسطنطین اعظم نے اس شہر کو دیکھ کر پیش گوئی کی تھی، یہ شہر اپنے محل وقوع کے اعتبار سے دشمن کی مدافعت کرنے کی پوری اہلیت رکھتا تھا، خواہ حملہ کسی طرف سے ہو۔ اس پر ہر طرف سے حملے ہوئے، تاتار، بلغار، ہنوں، گاتھوں، سلاویکیوں سب ہی نے اس پر حملہ کیا، لیکن اس نے سب کے حملوں کو رد کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ یہاں ایک جنگ جو، حملہ آور اور فاتح قوم پروان چڑھی اس حالت میں کہ قسطنطنیہ کی دولت اور قوت میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ مغربی یورپ کی جمعیت ٹوٹتی جا رہی تھی۔ بربروں نے یورپ اور اٹلی کو پامال کر ڈالا تھا، شہر روم ایک معمولی قصبہ رہ گیا تھا، ایک مختصر مدت تو ایسی گندی کہ شہر روم میں ایک شخص بھی زندہ باقی نہیں رہ گیا تھا، بس بھیڑیے اور چوہے تھے جو زندہ بچ گیے تھے۔ ایک بربری فاتح نے مفتوح رومنوں کی متوقع سرکشی کے پیش نظر ساری آبادی کو جلاوطن کر دیا!

عہد مظلمہ شروع ہو گیا، جہالت اور نادانی کے پردے اس مملکت پر پڑ گیے، جو کسی زمانے میں طاقتور رومن امپائر تھی، لیکن اس زمانے میں بھی

قسطنطنیہ میں علم کی شمع روشن تھی۔ اس مضبوط شہر کے کلیساؤں میں دین مسیحی
اس طرح فروزاں تھا جیسے شب تاریک میں روشن چراغ!

حضرت محمدؐ

قرونِ مظلمہ نے یورپ کو تاریکی میں ڈھانپ لیا۔ کئی صدیوں کے لئے تہذیب و تمدن کے برگ و شاخ پر پژمردگی چھا گئی۔ حجرہ ہائے کلیسا سے باہر نہ فن باقی رہ گیا تھا نہ ادب، ——— نہ جان و مال کا تحفظ تھا۔ نہ راستے محفوظ تھے، تجارت دم توڑ رہی تھی، صرف چند مدرسے تھے جو بمشکل جاری تھے۔ مسلسل چار صدیوں تک لوگوں کے دماغ اور روح پر جہالت مسلط رہی۔ روم، جس کی عظمت و شوکت کا کبھی ڈنکا بجتا تھا، اب وہاں کی سڑکوں پر جنگل اگ آئے تھے۔

یہ تھا مسیحی یورپ"!

اور ٹھیک اسی زمانے میں ایک انقلاب آفریں طاقت مشرق میں قوت و نمو حاصل کر رہی تھی، ایک چھوٹے سے مقام سے اس کا آغاز ہوا اور حیرت انگیز تیز رفتاری سے پوری دنیا پر چھا گئی۔ یہ قوت نہ کوئی سیاسی عقیدہ تھی نہ کسی فاتح کی آرزو، یہ ایک مذہبی تحریک تھی، عیسائیت کی طرح یہ مذہب بھی خدائے واحد پر اعتقاد رکھتا تھا، جس کا نام اس کی اصطلاح میں "اللہ" ہے، اس نئے دین کے پیغمبر محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) تھے، قسطنطنیہ کے حالات و حوادث کی رہنمائی میں اس مذہب کا ایک عظیم طاقت کی حیثیت سے بہت بڑا حصہ تھا۔

یہ عجیب فکر انگیز نکتہ ہے کہ مسیحیت، یہودیت اور اسلام، دنیا کے تین سب سے بڑے مذہب، دنیا کے ایک ہی گوشے سے نمودار ہوئے، یہ گوشہ وہ منطقہ ہے، جو بحیرہ روم کے جنوبی ساحل، بحر سرخ اور کوہستان یہودیہ (فلسطین) اور ریگ زار و کوہستان عرب کے مابین واقع ہے۔ یہ گرم خطہ ہے، یہاں جو چیزیں عام ہیں، وہ ہیں کھجور کے درخت، بکریوں اور بھیڑوں کے گلے، اونٹوں کے قافلے، اور خیمے، یہاں کی زندگی ویسی بوجھل نہیں جیسی یورپ کے سرد موسم میں نظر آتی ہے، اُس زمانے میں لوگوں کو اتنی فرصت اور یکسوئی حاصل تھی کہ اطمینان سے دشت و سیع میں بکریاں چراتے یا

اونٹوں پر بیٹھ کر مراحل سفر طے کرتے ہوئے غور و فکر کر سکیں یا وسیع و عریض صحراؤں میں خیمے نصب کریں، اور ان خیموں کے دروازوں میں بیٹھ کر سیر نجوم کریں، ان کی زندگی خلوت اور تنہائی کی زندگی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں اصحاب فکر و عزیمت اور روحانیت کافی پیدا ہوئے، انہوں نے خالق کو پہچانا، اور ہماری رہنمائی کی، سیدھا راستہ دکھایا۔

اسلام ریگ زار عرب میں پروان چڑھا!

ملک عرب کے باشندے ——— عرب ——— عبرانیوں کے بھائی تھے، اور نسلی اعتبار سے سامی، بائبل کے عبرانیوں کی طرح یہ حضرت ابراہیمؑ کو اپنا باپ (جد) مانتے تھے، حضرت ابراہیمؑ کی ایک بیوی سارہؓ کے بطن سے اسحاقؑ پیدا ہوئے اور دوسری بیوی ہاجرہؓ کے بطن سے اسماعیلؑ تولد ہوئے، عبرانی نسل اسحاقؑ سے ہیں اور عرب نژاد اسماعیلؑ! اسماعیلؑ اپنی ماں ہاجرہؓ کے ساتھ عربستان کے صحرائے گرم میں سرگرم رہروی تھے، کہ پیاس کی شدت نے بے حال کر دیا، حالت نازک ہو گئی، بیقراری اور بیتابی کے عالم میں زمین پر پاؤں رگڑنے لگے، فوراً ہی ایک چشمہ ابل پڑا، یہی جگہ ہے جہاں بعد میں مکہ عالم وجود میں آیا، اور یہی وہ چشمہ ہے جو بعد میں چاہ زم زم کے نام سے یاد کیا گیا، ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ نے بعد میں بنائے کعبہ ڈالی، اور مکہ بہت جلد زیارت گاہ عوام بن گیا۔

یہ قدیم ترین عہد یعنی ظہورِ موسیٰؑ سے بھی بہت پہلے کا واقعہ ہے۔ رومی شہنشاہیت اور قسطنطین اعظم نیز جسٹینین اعظم اور بعد کے شہنشاہان روم کے عہد میں جو یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے، سرزمین عرب "عملاً نامعلوم تھی" یہ ایک وسیع، خشک اور بے حد و نہایت صحرا تھا، جو مصر اور بحر احمر کے مابین واقع تھا، یہاں وحشی اور درندہ خو، اجڈ اور جاہل لوگ بستے تھے۔ جو سفید لباس میں ملبوس اسپ تیز رو پر سواری کیا کرتے تھے، اس کے ریگزاروں میں اونٹوں کی قطاریں قافلوں کو لے کر ادھر سے ادھر اور یہاں سے وہاں محوِ خرام رہتی تھیں، جیسے سمندر کی سطح پر کشتیاں، یہاں صنعت تھی نہ کاشتکاری۔ تھا کیا؟ صرف ریگزار، ریت کے ٹیلے، اسپ رانی، نہایت محدود اور مختصر پیمانے پر تجارت کا چلن بھی تھا۔ یہ ایک گمنام سی چیز شہنشاہوں، بادشاہوں اور کشور کشاؤں کا دامن اپنی طرف نہ کھینچ سکی، ان کے لئے تو عربستان کا وجود ہی مشکوک تھا"!

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پیغمبر دینِ اسلام کی ذات اس چھوٹے سے بیج کے مانند تھی، جس سے چھتنار اور گھنا درخت نمودار ہوتا ہے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ولادت ۵۷۰ء میں مکہ میں ہوئی، سارے عربستان میں مکہ ایک ایسا شہر تھا جو باقی دنیا سے کسی نہ کسی درجے میں ربط و تعلق رکھتا تھا، یہ بت پرستوں کا شہر تھا۔ یہ ایک کاروباری شہر بھی تھا اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ابھی سن شعور کو نہ پہنچے تھے کہ ایک

کارواں میں شریک ہو گئے جو سامان تجارت لے کر دوسرے شہروں کی طرف جا رہا تھا،

ایسے ایک سفر کے دوران میں ایک عیسائی راہب نے آپ کو دیکھا تو مستقبل میں آپ کے نبی ہونے کی شہادت اپنی کتاب مقدس سے دی۔

چند سال بعد ایک بیوہ خاتون (حضرت خدیجہؓ) سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے شادی کر لی۔ اس سے قبل خدیجہؓ کے مختار کار کی حیثیت سے آپؐ ایک کاروان تجارت میں شرکت بھی کر چکے تھے، خدیجہؓ عمر میں آپؐ سے بڑی تھیں، پھر آپؐ کو اور بھی کئی تجارتی قافلوں میں شرکت کا موقع ملا اور بعض عیسائی اور یہودی راہبوں اور پیشواؤں سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) امی تھے، آپؐ نے کسی طرح کی تعلیم نہیں حاصل کی تھی۔ لیکن غور و فکر آپؐ کی عادت میں داخل تھا، ہر بار سفر سے واپس آتے، تو دوران سفر میں جو کچھ دیکھا یا سنا ہوتا، اس پر تنہائیوں آسمان کے نیچے عالم تنہائی میں سکون اور یکسوئی کے ساتھ غور فرماتے، وہ اکثر سوچا کرتے کہ خدا کے سامنے انسان کتنا ضعیف اور بے بس ہے ——— ابراہیمؑ کا خدا خدائے یکتا و یگانہ، وہ ایک خدا پر ایمان لے آئے۔

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک بہت بڑے مصلح تھے، وہ نوع انسان بہتری اور برتری کے جویا تھے۔ جب ان کی عمر تقریباً چالیس سال کی ہو گئی تو منصب نبوت پر فائز کئے گئے، وہ جنت کی ترغیب دیتے، دوزخ سے ڈراتے

یوم حشر کو یاد دلاتے، جب کہ اعمال کا محاسبہ ہوگا، سب سے پہلے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی بعثت کا ذکر صرف خدیجہؓ اور بعض نہایت معتمد دوستوں سے کیا، رفتہ رفتہ دعوت کو ترقی ہوئی اور متبعین کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا، صحابہ کا گروہ آپ کے گرد حاضر رہتا اور جو وحی نازل ہوتی اس سے آپ انہیں باخبر کرتے، آپ پر وحی وقتاً فوقتاً نازل ہوتی اور جسے صحابہ لکھ لیا کرتے اس کا مجموعہ قرآن مجید ہے!!

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا قد لمبا، بدن چھریرا تھا، ریش مبارک گھنی، بال سیاہ، آنکھیں پرکشش، آپ نہایت متواضع تھے، اون کا معمولی لباس پہنتے موزے شاذ ہی استعمال کرتے، اپنی بکری کا دودھ خود دوہ لیتے، کنوئیں سے پانی خود بھر لاتے، گھر میں جھاڑو خود دے لیتے، چٹائی آپ کی نشست گاہ تھی اپنی جوتیاں بھی خود گانٹھ لیا کرتے بیواؤں، بیماروں اور معذوروں سے لطف وکرم کا برتاؤ کرتے، مہربانی کی باتیں کرتے، دل دہی کرتے، تسلی دیتے، ہو سکتا تو ان کا کام بھی کر دیتے، لیکن اس انکسار اور تواضع کے باوجود جب ان کی صدائے دعوت گونجتی تو اس شان سے کہ سننے والے مبہوت ہو کر رہ جاتے۔

قرآن کا پیغام کیا ہے؟ خدا کے بندوں کے ساتھ مساوات، اخوت اور محبت کا برتاؤ، خدائے واحد و یگانہ پر ایمان و اعتقاد۔ "اسلام" کے معنی ہیں، مشیت الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا، مسلم کا مطلب ہے، "اطاعت کیش" مسلمان تمام پیغمبروں کو حضرت ابراہیمؑ سے لے کر جناب مسیحؑ تک

احترام اور عقیدت کے ساتھ یاد کرتے ہیں، لیکن ان سب میں آپ کو بڑا اور خاتم النبیین مانتے ہیں۔

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے لوگوں کو شرک اور بت پرستی سے روکا اور بلاشبہ یہ ان کا بہت بڑا اور دلیرانہ کارنامہ ہے، کیونکہ عربستان میں بت پرستوں کا سب سے بڑا مرکز مکہ تھا، یہیں ان کا سب سے بڑا بت کدہ تھا، یہیں ان کے دیوتاؤں اور دیویوں کے استھان تھے، جہاں اطراف عرب سے مشرک اور بت پرست آآکر جمع ہوا کرتے تھے، آپؐ اور آپؐ کے چند متبعین کے سوا سارا مکہ بت پرست تھا کچھ عرصے تک تو یہ بت پرست صدائے توحید کا مذاق اڑاتے رہے، یہ آپؐ کو پاگل کہتے، لیکن جب بعد میں اس دعوت کی اثر آفرینی کا احساس ہوا تو دشمن بن گیے اور ایذا رسانی پر اتر آئے۔

کامل پندرہ سال تک محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس اہانت، ایذا رسانی اور مخالفت کو صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کرتے رہے، پھر آپ مدینے ہجرت کر گیے، مکہ سے مدینے کا یہ سفر ۶۲۲ء میں پیش آیا۔ سن ہجری اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

مدینے میں جو عربستان کا دوسرا بڑا شہر تھا، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو سکون اور اطمینان کے ساتھ دعوت کا موقع ملا، یہاں بہت سے لوگ آپؐ پر ایمان لے آئے، آپ نے قوانین و احکام الٰہی کی تعلیم و تبلیغ پر توجہ مبذول فرمائی اور ان کی

وضاحت فرمائی۔

آپؐ نے شراب نوشی اور تمام مسکرات کا استعمال ممنوع قرار دیا۔

جوئے کی ممانعت کی۔

رمضان کا پورا مہینہ روزے رکھنے کا حکم دیا۔

روز نماز پنجگانہ کا حکم صادر فرمایا۔

نماز کے لئے وضو لازمی قرار دیا، وضو کے لئے پانی میسر نہ آئے تو پاک مٹی سے تیمم لازمی قرار دیا۔

طہارت کی تاکید فرمائی۔

آخر میں جب آپؐ مکہ میں داخل ہوئے تو اس وقت پورے عرب میں آپ کی صداقت مسلّم ہو چکی تھی، مکہ اب بت پرستی کا مرکز نہ رہا تھا، کعبۃ اللہ بن گیا تھا یہ بیت خانہ اسلام کا قبلہ قرار پایا، جس کی طرف رخ کر کے دنیا کا ہر مسلمان پانچوں وقت نماز پڑھتا ہے، جب وہ سجدہ میں جاتا اور رکوع میں جھکتا اور قیام میں سر اٹھاتا ہے تو اس کا رخ اسی جانب ہوتا ہے۔

چونکہ آپؐ کی تعلیمات عملی تھیں، آپ کی سیرت بے داغ تھی اور آپ کی زبان ترجمان حقیقت تھی لہٰذا اپنی زندگی ہی میں عرب کو پرچم اسلام تلے جمع کرنے میں پورے طور پر کامیاب ہو گئے، صحرا گرد اور وحشی قبائل، پابند صوم صلوٰۃ اور زاہد و متقی ہو گئے، اب نہ یہ شراب کو چھوتے تھے نہ جوئے سے دلچسپی رکھتے

تھے، بہت جلد یہ ایسے سپاہی بن گیے، جو دوسری فوجوں پر بدرجہا فوقیت رکھتے تھے۔ بکریاں چرانے والے بہت جلد فاتح اور کشور کشا بن گیے۔

تاریخ میں مسلمانوں کا ذکر پہلے پہل "سیراسن"[1] کے نام سے آیا، پھر یہ "مورے"[2] کے نام سے، خاص طور پر سپین میں، یاد کیے جانے لگے، اس مذہب کو تیرہ سو سال کی مدت گزر چکی ہے، یہ دنیا کے مذہبوں میں دوسرا بڑا مذہب ہے پروٹسٹنٹ[3] عیسائیوں سے، مسلمان تعداد میں دوگنے ہیں۔

اب بھی عہد نبوی کی طرح، طلوع و غروب آفتاب کے وقت اور دوسرے اوقات میں مؤذن مینار مسجد کی بلندی سے اذان دیتا اور خدائے یگانہ کی عبادت کے لیے بلاتا ہے، اذان سنتے ہی مسلمان سارے کام چھوڑ کر وضو کرتے اور مسجد میں پہنچ کر شریک نماز ہو جاتے ہیں، ہر مسلمان پر بشرط صحت و استطاعت عمر میں ایک مرتبہ حج یعنی زیارت کعبہ فرض ہے۔ خواہ وہ کسی دیس کا رہنے والا ہو۔

۶۳۲ء میں جب کہ آپؐ کی عمر ۶۳ سال کی تھی، آپؐ نے اس دنیا سے پردہ فرمایا، اور صرف ایک سو سال کی مختصر سی مدت میں آپ کے جانشینوں نے

۱۔ SARCEN

۲۔ MOOR

۳۔ PROTESTANT

دنیا کا بہت بڑا حصہ فتح کر لیا، حتیٰ کہ آپ کے صحابہ ہی کے زمانے میں اسلام مکہ سے نکل کر ایشیا میں دریائے سندھ اور بحر اوقیانوس کی پنہائی تک پھیل گیا۔

دین اسلام درحقیقت دین اخوت ہے، یہ خدائے واحد کے پرستاروں کو بھائی بھائی بنا دیتا ہے، رنگ، نسل، ذات، قوم، ملک، کوئی اختلاف بھی اسلام کی بنائی ہوئی ملت کی راہ میں رکاوٹ نہیں ہے۔

مسلمانوں نے یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ ہمیشہ انتہائی رواداری کا برتاؤ کیا، کیونکہ وہ انہیں اہل کتاب مانتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی خطا کاریوں سے بھی وہ درگذر کرتے رہے ہیں، انہیں ذمی بنا کر، ان کی حفاظت جان و مال کا فرض ادا کرنے میں بھی پیش پیش رہے ہیں، صرف ایک معمولی سا ٹیکس لے کر، جو مسلمانوں کے مقابلے میں بہت کم تھا، انہیں جنگی خدمات سے مستثنیٰ کر دیتے تھے۔ یہ رقم رفاہ عام پر خرچ کی جاتی تھی۔

مسلمانوں نے ۶۴۲ء میں مصر فتح کیا، ۶۵۰ء میں ساری مملکت ایران فتح کر ڈالی، کلیسا کے ناقوس خاموش تھے، مسجد کے میناروں سے صدائے اذان بلند ہو رہی تھی۔ ۷۰۰ء سے پہلے پہلے مسلمانوں نے سارا شمالی افریقہ زیر نگیں کر لیا اور کچھ ہی مدت بعد سارا اسپین۔

ایشیائے کوچک کی سرزمین جب مسلمانوں کے
گھوڑوں سے پامال ہونے لگی تو قسطنطنیہ لرز اٹھا!

قسطنطنیہ پر مسلمانوں کے حملے

رحلت پیغمبرؐ کے بعد مسلمانوں کی نظریں قسطنطنیہ پر مرکوز ہو گئیں، کیونکہ آپؐ کا ارشاد تھا، جو پہلی فوج قسطنطنیہ پر حملہ کرے گی اس کے گناہ بخش دیے جائیں گے[1]

---

[1] یہ حدیث غلط ہے، اس پر علمائے حدیث کافی گفتگو کر چکے ہیں، اس حدیث کے تمام

(باقی صفحہ نمبر ۶۲ کے نیچے)

"خوشا وہ امیر، اور خوشا وہ فوج جو اس فتح کو اتمام تک پہنچائے گی!"[1]

آپ کی وفات کو چالیس سال سے زیادہ مدت نہیں گذری تھی کہ مسلمانوں نے فتح قسطنطنیہ کی جد وجہد شروع کر دی چھ سال کی طویل مدت تک ایک فوج محاصرہ کیے پڑی رہی، لیکن قسطنطنیہ کی دیواریں مضبوط ثابت ہوئیں، اس میں رونما نہ ہو سکا، آخر معمر خلیفہ اور دل برداشتہ فوج نے محاصرہ اٹھا لیا۔

اور ایک نسل گذر گئی مسلمانوں نے اُدھر کا رُخ نہیں کیا۔

۷۱۷ء میں عربوں نے دوسرے حملے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس مرتبہ کا حملہ پہلے سے زیادہ سخت تھا۔ سپاہ زیادہ بھی تھی اور مضبوط تر بھی لیکن اس بار بھی نتیجہ حسب دل خواہ نہ نکلا۔

بقیہ نوٹ نمبر[1]

راوی شامی ہیں اس لئے علمائے فقہ نے اس پر جرح کی ہے، اور اسے ناقابل اعتبار قرار دیا ہے، کیونکہ اس سے صرف شامیوں کی منقبت نکلتی ہے، تاکہ ان کے دامن سے خون حسینؓ کا دھبہ دھل جائے۔ (مترجم)

[1] اس حدیث میں "مدینۂ قیصر" کا لفظ آیا ہے جس سے مراد حمص ہے، کہ وہی آنحضرتؐ کے زمانے میں شہر قیصر تھا اور مسلمانوں کی تخریب اور تباہی کے درپے تھا، قسطنطنیہ سے نہ مسلمانوں کو دشمنی تھی، نہ اس کی اتنی اہمیت تھی۔ (مترجم)

مسلمانوں نے پہلے تجارت کی روشنی میں محسوس کر لیا تھا کہ قسطنطنیہ کی فصیل ناقابل تسخیر ہے، چنانچہ اس مرتبہ انہوں نے بحری حملے کا یہ پروگرام بنایا، اس حملے میں ۱۸۰۰ کشتیاں استعمال کیں، فوج کی تعداد ۱۲۰۰۰۰ تھی۔

قسطنطنیہ نے اس لشکر گراں کا بھی پامردی سے مقابلہ کیا اور آخر کار اسے واپس جانے پر مجبور کر دیا۔ یہ کارنامہ شہنشاہ لیو کا تھا جو لیو دی آئسوریئن[1] کے نام سے مشہور تھا۔ لیو بہت بڑا شہنشاہ اور بہت بڑا جرنیل تھا، ایک کسان جو سپاہی بنا، جس نے معرکہ آرائیوں میں حصہ لیا، اور عین نوجوانی کے عالم میں سب سے اپنا لوہا منوا لیا۔

لیو ایک ہوشیار مدبر تھا، اس نے محسوس کر لیا تھا کہ اس کی رعایا کو ایک طویل اور صبر آزما محاصرے کا سامنا کرنا ہے، مسلمان ابھی راستے میں تھے کہ اس نے ضروریاتِ زندگی سے متعلق تمام چیزیں بافراط جمع کر لیں، پھر بھی یہ خطرہ تھا کہ مسلمانوں کی جنگی کشتیوں نے ناکہ بندی کر لی تو اناج باہر سے نہ پہنچ سکے گا اور شہری بھوکے مر جائیں گے۔ چنانچہ اس نے خود اپنے بیڑے کو مضبوط کرنے کی سعی بھی جاری رکھی، کشتیوں کی تعداد اتنی کم تھی کہ جارحانہ حملہ کرنے کی سکت ہی نہیں تھی، لیکن اپنے بیڑے کو بڑی فراست سے بندرگاہ کے دہانے پر ایک مضبوط زنجیر باندھ کر محفوظ کر لیا، جس کی وجہ سے کسی بیرونی کشتی کے لئے بندرگاہ میں سلامتی کے ساتھ داخل ہونا ممکن نہ رہا، آئندہ ہم اس کے بارے میں مزید گفتگو

[1] LEO THE ISAURIAN

کریں گے، لیو نے ایک نہایت مہلک اور جان سوز "خفیہ ہتھیار" بھی تیار کر لیا، اس کا ذکر بھی آگے چل کر تفصیل سے آئے گا، مختصراً یوں سمجھیے، کہ یہی وہ چیز تھی جو تاریخ میں آتش یونان[1] کے نام سے آج تک مشہور ہے۔

(خیال ہے کہ "آتش یونان" ایک مرکب تھا، گندھک اور رال کا، ان اجزا کی باہمی ترکیب ایک راز تھی، چنانچہ جن لوگوں نے یہ خفیہ ہتھیار بنایا تھا ان کی زبانیں کاٹ دی گئی تھیں، کہ راز افشا نہ کر سکیں، یہ راز ۴۰۰ سال تک قسطنطنیہ نے محفوظ رکھا۔)

اب لیو ہراساں نہ تھا، اس کے پاس مردانِ شہر کی فوج تھی۔ جس کے لئے جملہ ضروریات مہیا تھے۔ ناقابل تسخیر فصیل شہر تھی، استحکامات تھے، قلعہ بندیاں تھیں، تھوڑی بہت کشتیاں بھی تھیں، لیکن ہر خطرے سے محفوظ اور سب سے بڑھ کر "خفیہ ہتھیار" یعنی آتش یونان تھا!

۷۱۷ء[2] کا موسم سرما اتنا سخت اور ناقابل برداشت تھا کہ ہزاروں محاصرین سردی کی تاب نہ لا کر جاں بحق ہو گئے، کیونکہ یہ لوگ گرم آب و ہوا کے عادی تھے۔ باسفورس میں چلنے والی زہریلی آندھیوں اور تیر کی طرح بدن میں پیوست ہو جانے

---

[1] GREEK FIRE

[2] سنہ ۹۹ھ

والے ہوا کے جھکڑوں نے محاصرین کی کشتیوں کو نکما کر دیا، فصیل تک آتے آتے محاصرین کی تعداد بہت کم ہو گئی۔

یہ وقت تھا جب لیو نے پہلی اور آخری ضرب لگانے کا فیصلہ کیا، سلامہ موسم سرما اس طرح گزرا کہ زنجیر کے سلسلۂ دراز و محکم نے ہر طرح سے بندرگاہ کو محفوظ اور بند رکھا، اب لیو نے دشمن کو زک دینے کے لئے دام بچھایا، زنجیر ہٹالی اور بندرگاہ کو کھول دیا۔ شاہی بیڑا تیار حکم کا منتظر کھڑا تھا، جیسے ہی دشمن کی کشتیاں نزدیک پہنچیں، "آتش یونان" کی بارش شروع ہو گئی، نتیجہ یہ ہوا کہ بہت کم کشتیاں بچ کر جا سکیں۔

"آتش یونان" ہر طرف سے برسائی گئی، کشتیوں پر سے، فصیلِ شہر کے اوپر سے، اندرون شہر سے، نتیجہ یہ ہوا کہ دشمن کی کشتیاں بھاگڑ میں ایک دوسرے سے ٹکرانے لگیں، لوگ اس آتش سوزاں کی تاب نہ لا کر سمندر میں کود پڑے، اور ڈوب گیے، کلیں ٹوٹ گئیں۔ بادبان شکستہ ہو گیے چپو بکھر گیے، باسفورس کی تند و تیز لہروں کا مقابلہ نہ کر سکنے کے باعث بہت سی کشتیاں الٹ گئیں، اور غرق ہو گئیں، جنگ ختم ہو گئی، صرف پانچ کشتیاں شام پہنچ سکیں اور ماجرا سنایا۔

کہانی جو باقی ماندہ لوگوں نے شام جا کر سنائی، آتش یونان کی کہانی تھی، انہوں نے بتایا کہ آتش یونان وہ چیز ہے جو بڑے بڑے مشکوں میں بھر کر یا ڈبوں میں بند کر کے دشمن پہ پھینکی جاتی ہے، اسے تیروں اور نیزوں کی مدد سے بھی

پھینکا جاتا ہے، پھر ایسی آگ بھڑکتی ہے جسے کسی طرح بھی نہیں بجھایا جا سکتا۔ حتیٰ کہ پانی سے بھی نہیں بجھتی برابر جلتی اور جلاتی رہتی ہے۔

اگر ۱۷۱۷ء کے حملے میں قسطنطنیہ فتح ہو گیا ہوتا تو مسیحیت کا نام و نشان بھی دنیا میں باقی نہ رہ جاتا یہ لیو کی تدبیر اور دلیری تھی کہ پانچ سو سال کے لئے مسیحیت اور قسطنطنیہ کو زوال نہ آیا، اگر طیونہ ہوتا تو تاریخ کا فیصلہ کچھ اور ہوتا، اگر ۱۷۱۷ء میں مسلمان کامیاب ہو گیے ہوتے تو اسلام جہان مسیحیت پر فرماں روائی کر رہا ہوتا۔

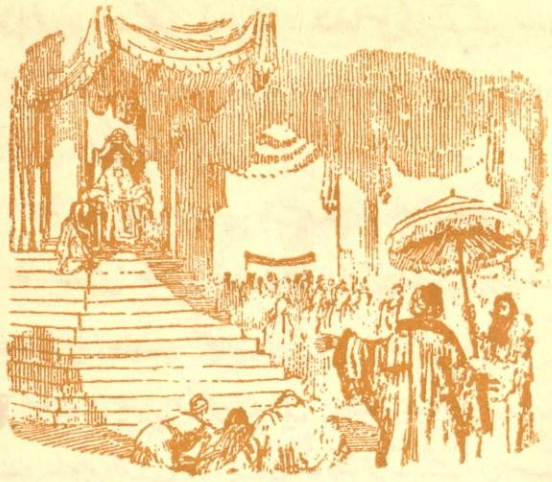

قسطنطنیہ کا عہد عروج

۱۷۱۷ء میں مسلمانوں کی شکست کے بعد ۳۰۰ سال تک بازنطینی شہنشاہیت کو اتنا فروغ ہوا کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ قسطنطنیہ پہلے سے کہیں زیادہ طاقتور کہیں زیادہ دولت مند اور کہیں زیادہ مضبوط ہو گیا۔ مسلمان اپنے مراکز بغداد، دمشق اور قرطبہ[1] میں پھیل گئے، بازنطینی یا دوسرے الفاظ میں یونانی قوم، وقار کو

---

[1] CORDOVA

چھوڑ کر خود جارحانہ حملے کرنے اور فتوحات حاصل کرنے لگے، ۰۰۰اہیں یونانی یا بازنطینی شہنشاہیت کا دامن ۶ چھ لاکھ ۵۰ ہزار مربع میل تک وسیع ہو گیا، اور آبادی ۲۰ لاکھ تک پہنچ گئی

شہنشاہ بیزل^ل^ دوم یونان یا بازنطیم کا پہلا سامراجی فرماں روا تھا، اس کے دور حکومت میں قسطنطنیہ انتہائے عروج کو پہنچ گیا۔ اس کی ثروت ساری دنیا کے لئے مایۂ حسرت و استعجاب بن گئی۔

بہت سی چیزیں جو ابھی موجود ہیں، بہت سے خطوط اور روزنامچے جو یہاں آنے والے سوداگروں اور تاجروں نے وقتاً فوقتاً لکھے، ان سب کو سامنے رکھ کر اس عہد کا قسطنطنیہ متشکل ہو کر نظر کے سامنے آجاتا ہے۔

شہنشاہ کا محل غایت درجہ پُرشکوہ، اور مرصع تھا۔ اس کا صحن دریائے مارمؔرا کے رخ پر تھا، اس محل میں برآمدے تھے، بارہ دری تھی، باغ تھے، حمام تھے، کتب خانے تھے، قید خانے تھے۔ ہزاروں حکام اور ملازمین کے مکانات تھے، کئی کئی منزلہ کوٹھیاں تھیں، قصر کے خاص خاص کمرے سنگ اور سنگ مرمر کے بنے ہوئے تھے یہاں نہایت نظر فریب نقاشی کے نمونے نظر آتے تھے، طرح طرح کے مجسمے تھے، یہاں ایک حوض جس

ل BAZIL

کا رو کش چاندی کا تھا ، سال میں ایک مرتبہ میوہ ہائے لذیذ سے پر کر دیا جاتا تھا، اور لوگوں کو عام اجازت ہوتی کہ خوب لذت اندوز ہوں ، شہنشاہ اپنے تخت زریں پہ متمکن اپنی رعایا کو سیب یا انار کے لیے محو کشاکش دیکھ کر لطف اندوز ہوتا ۔ کلیسائے ہاگیو صوفیہ مذہبی تقریبات کا مرکز تھا ۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ بڑی بڑی شمعوں کی روشنی میں اور چھت سے لٹکے ہوئے فانوسوں اور لالٹینوں کے پرتو میں یہاں سے وہاں اور ادھر سے ادھر گشت کرتے ، کلیسا کا گنبد دریائے نور میں غرق ہو جاتا ، سرود خواں طائفوں کی آوازیں جو اس گنبد بلند کے نیچے سے بلند ہوتیں ، اور ان کی آواز بازگشت سے سارا کلیسا گونج اٹھتا ، جیسے فرشتے مصروفِ تسبیح و مناجات ہوں اور ان کی صدائے تہلیل آسمان سے فرش زمین پر آ رہی ہو ۔

شہر کے بازار میلوں تک پھیلے ہوئے تھے ، دنیا ، جہاں کی ہر چیز یہاں بہ آسانی دستیاب ہو سکتی تھی ، جواہرات ، ہاتھی دانت پر کندہ کاری کے بے نظیر نمونے ، عطر ، بخور ، گل دوزہ ، پارچہ جات ، زیورات ، برتن ، کون سی چیز تھی جو یہاں نہیں ملتی تھی ؟ یہاں کے پرپیچ اور خم دار کوچوں اور گلیوں میں ہر ملک کے لوگ نظر آتے تھے ، سیاہ فام عرب ، کشادہ رو روسی ، اونچی اور نکیلی ناک رکھنے والے وینسی ، اٹلی کے ماہی گیر ، یہودی تاجر ، آرمینا کے گلہ بان ، جو اپنی بھیڑیں بکریاں فروخت کرنے کے لیے آیا کرتے تھے ، ہندو

حبشی اور کبھی کبھی چپٹے چہروں والے چینی بھی نظر آجاتے تھے، اسکینڈی نیویا کے باشندے اور انگریز اپنے بڑے بڑے جہازوں پر قسطنطنیہ آیا کرتے تھے۔

بااین ہمہ قسطنطنیہ ایک خالص یونانی شہر تھا۔

قسطنطنیہ میں شفاخانے تھے، یونیورسٹیاں تھیں، یتیم خانے تھے، قانون اور طب کی درسگاہیں تھیں، راہبوں کی خانقاہیں تھیں، ساتھ ہی ساتھ تنگ اور کثیف، کوچے، گندے اور غلیظ گھر، بدبودار اور کیچڑ سے لت پت علاقے بھی تھے، جہاں رات بھر کتے بھونکتے، جہاں چور اور رہزن پناہ لیتے، جہاں معصیت کار اپنے اڈوں میں داد عیش دیتے، ایک سیاح لکھتا ہے "اگر قسطنطنیہ دولت و ثروت اور شکوہ و شوکت کے اعتبار سے دنیا کے دوسرے شہروں پر فائق ہے تو فسق و فجور کے لحاظ سے بھی سب پر بالا ہے!

خوبصورت باغات سے گھرے ہوئے شاندار اور خوشنما مکانات بحیرہ مارمورا کے ساحل اور جزیرے نیز باسفورس کے یورپی اور ایشیائی کناروں کے ساتھ ساتھ پھیلے ہوئے تھے ——— یہ قسطنطنیہ کے امراء اور اشراف و اعیان کے دولت کدے تھے،

اور جہاں تک خود قسطنطنیہ کا تعلق تھا۔ سو وہ تو ایک مرکز تھا ہی، یہ بازنطینی شہنشاہیت کا قلب تھا، جس طرح پیرس فرانسیسی قوم کا قلب ہے۔

یہاں کے شہنشاہ خدائی کرتے تھے، جو شخص بھی شہنشاہ کے حضور میں

شرف باریابی حاصل کرتا، ضروری تھا کہ سجدہ ریز ہو جائے، اور شہنشاہ اکڑی ہوئی گردن اور تنے ہوئے سینے کے ساتھ تخت کبریائی پر متمکن رہتا۔ جامۂ شاہی موتیوں، ہیروں اور جواہرات سے اتنا گراں بار ہوتا کہ بعض دفعہ شہنشاہ کو بیٹھنا مشکل ہو جاتا، تاج زرنگار، سونے چاندی اور موتی کی لڑیوں سے گندھا ہوتا اور یہ لڑیاں شانوں تک لٹکی ہوتیں۔ تخت کے دونوں طرف ایستادہ دو طلائی شیر گرجتے، مصنوعی پرندے بالائے سر نغمہ سرا ہوتے۔

کبھی ایسا ہوتا کہ شرف حضوری حاصل کرنے والا کوئی شخص پس از سلام و تعظیم آہستہ سے سر اٹھا کر دیکھتا تو نظر آتا کہ تخت شاہی ہوا میں معلق ہے۔ چند خفیہ کمانیوں اور کلوں کی مدد سے یہ نظر فریب کرتب دکھایا جاتا، کہ عوام یہ منظر دیکھ کر متحیر ہو جائیں جب کبھی شہنشاہ قصر سے باہر نکلتا تو نقیب اور چاؤش آگے آگے چلتے اور لوگوں کو بتاتے کہ شہنشاہ کی سواری آ رہی ہے، کہ وہ گل پاشی کریں، عطر ریزی کریں، تخت شاہی کو غلاموں کی ایک قطار کندھے پر اٹھائے ہوتی۔ شہنشاہ کی ریش اور موئے سر سنہرے رنگ میں لب و رخسار شنگرفی رنگ میں رنگے ہوتے، بدن پر جو لباس ہوتا وہ زردوزی اور جواہرات کا مرقع ہوتا۔ اس وضع و ہیئت میں وہ ایک دیوتا معلوم ہوتا تھا۔

لیکن یہ سب کچھ محض تصنع اور دکھاوا تھا، حکومت بہرحال مضبوط و مستحکم تھی، امن و سلامتی کا معیار اتنا اونچا تھا کہ دنیا کا کوئی ملک اس کی ہمسری نہیں کرتا تھا،

بلکہ آئندہ تین سو سال میں بھی نہیں کر سکا تھا۔ جب لندن اور پیرس کے باشندے کثیف اور غلیظ کنوئیں کا پانی پیتے تھے تو قسطنطنیہ کے باشندے آب مصفا پیتے تھے، جو دور دراز مقام سے لایا جاتا تھا، قانون اور آئین کی پابندی اس طرح کرائی جاتی تھی کہ اگر آج کی دنیا کا کوئی شخص ماضی بعید کے قسطنطنیہ میں پہنچ جاتا تو آرام، سکون، سلامتی اور ذہنی آسودگی کے ساتھ دن گزار سکتا۔

تجارت اور تہذیب و ثقافت میں بھی قسطنطنیہ کا پلہ اپنے وقت کی دنیا پر بھاری تھا، تاجروں کے قافلے مال بیچنے اور خریدنے دور دور سے آیا کرتے تھے، شمال اور مشرق سے کارواں پر کارواں صبح شام آتے رہتے تھے، جنوب اور مغرب سے جہازوں کے بیڑے سمندر کی موجوں سے کھیلتے لنگر انداز ہوا کرتے تھے، ہندوستان سے ہیرے آتے تھے، مسالا آتا تھا، چین ریشم بھیجتا تھا، بغداد اور شام سے قالین لائے جاتے تھے، شمال سے اور بحر اسود کے راستے سے گندم اور پوستین کی درآمد ہوتی تھی، بلقان سے کتان اور اناج آیا کرتا تھا، مغرب سے ناروے سے لے کر اٹلی تک ہر خطۂ ارض کے اغوا کیے ہوئے لڑکے غلام بنا کر لائے جاتے تھے۔

قسطنطنیہ خود اپنی صنعت بھی رکھتا تھا، ان سب پر جو محاصل لگائے گیے تھے، ان سے بہت کافی یافت ہو جاتی تھی، اناطولیہ (ایشیائے کوچک) میں اس کی وسیع و عریض چراگاہیں تھیں، جہاں گوسفندوں کے ریوڑ کے ریوڑ

موجود رہتے تھے، شمالی یونان میں گیہوں کے کھیت تھے۔

بیزل دوم کے انتقال کے وقت قسطنطنیہ کے خزانۂ شاہی میں تقریباً بیس کروڑ روپے[1] نقد موجود تھے جنہیں آج کے حساب سے ایک ارب کے برابر سمجھنا چاہیے۔ ۱۰۰۰ء میں باز نطیم کا شہنشاہ دنیا کا سب سے بڑا دولتمند حکمران تھا۔

---

[1] مصنف نے چالیس ملین ڈالر لکھا ہے، میں نے ایک ڈالر کی قیمت پانچ روپے قرار دے کر یہ رقم لکھی ہے۔ (مترجم)

مسلمان اور عیسائی

"کافر وہ ہے جو کسی دین کا معتقد نہ ہو، عہد وسطیٰ میں یہ اصطلاح
خاص طور پر مسلمانوں کے لئے استعمال کی جاتی تھی۔ مسلمان
بھی عیسائیوں کو اس نام سے یاد کرتے تھے۔!"

۱۰۰۰ء میں قسطنطنیہ اوج افتخار و عروج پر پہنچا ہوا تھا، وہ سیم و زر،
مروارید و مرمر، ریشم اور دیبا کی فردوس نعیم بنا ہوا تھا، وہاں کا شہنشاہ ثروتمند

متکبر اور ناقابل تسخیر قوت کا مالک تھا۔ تجارت کی گرم بازاری تھی، کلیسا دین عیسوی کے پیروؤں سے معمور تھے۔

اور اس زمانے میں یورپ کے جنگل بے کشت و زرع تھے، وہاں کے لوگ پسماندہ اور ناتراشیدہ تھے، اور بہت دور وسط ایشیاء کے میدانوں اور بیابانوں میں ایک عزم سے بھرپور نہ تھکنے والی اور سراپا ولولہ قوم ابھر رہی تھی۔

شمال میں (پاکستان اور) ہندوستان کے عظیم سلسلۂ کوہ کے شمال میں مغرب کی طرف دریائے خزر[1] اور مشرق میں قدیم چین کے درمیان صحرا گرد قبائل زندگی بسر کر رہے تھے، اس زمانے کے دوسرے دور افتادہ علاقوں میں رہنے والے باشندوں کی طرح یہ لوگ بھی ہمیشہ نقل مکانی کرتے رہتے۔ اور موج ہوا کی طرح ادھر ادھر بھٹکتے رہتے، کھونٹے اکھاڑے، سیاہ رنگ کے خیمے اٹھائے اور کسی چوپائے کی پیٹھ پر رکھ کر خود گھوڑے پر سوار ہوئے، اور اپنے گلوں کے لئے کسی نئی چراگاہ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے، اور پھر صبح یہاں، شام وہاں، اس دشت بادخیز کا موسم بہت سرد تھا اور سردی سے مقابلے کی ضرورت انہیں مسلسل رواں دواں رکھتی۔

انہی صحرا گرد قبائل میں ترک بھی تھے

---

[1] CASPIAN SEA

تاریخ میں پہلے پہل ترکوں کا ذکر اسپ بان، گلہ بان، اور خانہ بدوش کی حیثیت سے آتا ہے، ان صحرانوردوں کا نہ کوئی گھر تھا، نہ مقام، نہ یہ تہذیب سے آشنا تھے، نہ ثقافت سے، اگر ان کا کوئی مذہب تھا، تو شرک اور بت پرستی لیکن بہرحال یہ جملہ قبائل میں اپنی خوئے پیکار کے باعث امتیاز و اختصاص رکھتے تھے۔ جنگ کے میدان میں یہ نہایت ہشاش بشاش نظر آتے جیسے دل کی مراد پا گیے ہوں، ان کے سردار اچھی طرح جانتے تھے کہ فوج کس طرح لڑائی جاتی ہے، اور کیوں کر منظم کی جاتی ہے۔ ہر ترک کی دلی آرزو یہی تھی، کہ میدانِ جنگ میں جان دے، بستر پہ مرنا ان کے نزدیک باعث ننگ تھا، ایران کی سرحد پر ان صحرا گردسپاہیوں کی مسلمانوں سے مڈبھیڑ ہوئی، جو اب بادیہ گرد نہیں، بلکہ شہر نشین تھے، اور باقاعدہ فوج رکھتے تھے۔ یہ اسلامی فوج کے کردار سے بے حد متاثر ہوئے۔ چند نے اسلام قبول کر لیا اور پھر جنگل کی آگ کی طرح ترک قبائل میں یہ دین پھیلنے لگا، اور بجا طور پہ کہا جا سکتا ہے کہ سنہ ۱۰۰۰ء میں ترک بحیثیت قوم کے مسلمان ہو چکے تھے، ترکوں کا اسلام قبول کرنا ایک بہت بڑا واقعہ تھا، کیونکہ، دو عظیم قوتیں، —— اسلام اور ترک —— ترکیب پا کر ناقابل تسخیر بن گئیں، اگر اسلام نہ ہوتا تو بلاشبہ ترک آج بھی وسطی ایشیا میں گلہ بانی کر رہے ہوتے، اور اگر ترک نہ ہوتے تو اسلام کو فروغ کا اتنا زیادہ موقع شاید نہ ملتا۔

ترکوں کے ایک ہاتھ میں تلوار تھی ایک میں قرآن، یہ لوگ سنگین انہوں نے اسلام کو ایک مضبوط مذہب بنا دیا۔ بہ زور شمشیر مذہب کی اشاعت کرنا اس زمانے میں ترکوں کی سرشت تھی، اور یہی جذبہ لے کر وہ دنیا کو فتح کرنے بڑھے[1]

---

[1] یہ مصنف کی انتہائی لاعلمی ہے، جو انہوں نے ترکوں سے یہ بات منسوب کی ہے، ترکوں کی رواداری کے بارے میں حیرت ہے، مصنف کی نظر خود عیسائی مؤرخین کے اس مدلل مفصل مواد پر نہیں گئی جو درجنوں مستند کتابوں میں بکھرا پڑا ہے، اسے سامنے رکھ کر ترکوں کی مذہبی رواداری پر ایک دفتر بے پایاں تحریر کیا جا سکتا ہے۔ اسلام کا حکم تھا لا اکراہ فی الدین۔ ترک کیا اس لئے مسلمان ہوئے تھے کہ اسلام قبول کر کے اس کے بنیادی حکم کو پامال کریں۔؟

اگر ترک ایک ہاتھ میں تلوار اور ایک ہاتھ میں قرآن لے کر نکلے ہوتے تو آج یونان میں کوئی عیسائی بچتا؟ بلقان کی ریاستیں مشرف بہ اسلام نہ ہو چکی ہوتیں؟ ترکوں کی لوک سنگین سے بچ کر کس طرح یونان اور بلقان کے عیسائی اب تک زندہ ہیں؟ اور اپنی قومی حکومتوں کے مالک ہیں، ترکوں ہی کے ایک سلطان کا واقعہ متعدد یورپین مؤرخین نے شرم و ندامت کے ساتھ لکھا ہے، کہ جب کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں میں برسرِ آرائی ہو رہی تھی تو ایک عیسائی بادشاہ نے مخالف فرقے پر جو بہر حال اس کا ہم مذہب تھا، سفاکی اور درندگی کے ساتھ ظلم توڑے، اور اس زمانے میں ترک

(باقی اگلے صفحہ پر)

ایشیائے کوچک میں جن ترکوں نے پہلے پہل قدم رکھا وہ سلجوق تھے، اپنے فرماں روا سلطان الپ ارسلان کی سربراہی میں ترک مشرق سے نکل کر آرمینیا میں آکر آباد ہو گئے جو اس علاقے کا سب سے زرخیز خطہ تھا، جو ابھی حال ہی میں بازنطینی مملکت کا ایک حصہ بنا تھا۔

ترکوں کا یہ داخلہ چیلنج تھا قسطنطنیہ کے لئے، نیز بزرگان شہر کے لئے۔ جو اب تک آسائش، راحت اور سلامتی کی زندگی بسر کر رہے تھے، اور سب سے بڑھ کر شہنشاہ رومانوس چہارم[1] کے لئے، چنانچہ ۱۰۷۱ء میں شہنشاہ نے ایک فوج گراں اس مقصد کے لئے بھیجی کہ ان نو واردوں کو

(گزشتہ حاشیہ)

سلطان اعلان کر رہا تھا کہ میں مسجد کے چہار پہلو گرجا بناؤں گا اور ہر شخص کو آزادی دونگا کہ خواہ یہاں چلا آئے، خواہ وہاں چلا جائے۔

اس جگہ اجمالی طور پہ اتنا اشارہ کافی تھا لیکن ترکوں کی مذہبی رواداری پہ آگے چل کر اپنے تتمے میں ذرا تفصیل عرض کروں گا کہ نوک سنگین کے بل پہ اسلام پھیلانے کا الزام ترکوں پر کتنا بڑا ظلم ہے۔ (مترجم)

---

[1] ROMANOS ۴۶۷

نکال باہر کیا جائے، یونانی سپاہیوں کو، ان سبک پوش چابک گرد، اور تند رو ترک سواروں کا تعاقب کرنے میں بڑی دقت پیش آتی کہ یہ بھاری بھرکم زرہ اور خود کے بوجھ سے دبے جا رہے تھے۔ لیکن ایک مرتبہ جب آمنا سامنا ہو گیا تو یونانی کامیاب رہے، یہ مقابلہ آرمینیا کی سرحد پر ہوا۔ یہ لڑائی "جنگ مینزیکرٹ[1] کے نام سے مشہور ہے، یہ معرکہ تاریخ میں ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔

یونانیوں کے بھاری بھرکم سلاح جنگ، وزنی زرہ اور خود نے ان کی رفتار میں کمی تو کر دی، لیکن دشمن کے حملوں سے ان کی جان بھی بچائی؛ بلاشبہ اس تاریخی جنگ میں یونانیوں یعنی بازنطینیوں کو تاریخی فتح ہوتی، اگر خود بعض یونانی غداری نہ کرتے، اس غدار کا نام اینڈرانیکس[2] ہے۔ جیسا کہ اسے حکم دیا گیا تھا، بجائے اپنے سپاہیوں کو معرکۂ کارزار میں دشمن کے سامنے لانے کے، یہ انہیں واپس لے گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لڑنے والی صف بے یار و مددگار رہ گئی لیکن یونانی اس وقت تک لڑتے رہے جب تک ان کا ایک ایک آدمی ہلاک نہ ہو گیا۔ جنگ جب آخری طور پر اختتام کو پہنچی، تو شہنشاہ رومانوس اپنے ہلاک شدہ

---

۱ MANZEKERT

۲ ANDRONIKOS

گھوڑے کے نیچے سے گھسیٹ کر ترک سلطان کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ نشانِ فتح کے طور پر جیسا کہ اس زمانے میں دستور تھا، سلطان الپ ارسلان نے اپنا پاؤں اس کی گردن پر رکھا۔

یہ تھا انجام کا آغاز،

بازنطینی مملکت کے شہر پہ شہر ناقابلِ تسخیر سلجوقیوں کے قبضے میں آتے جا رہے تھے، دس سال تک ترک ایشیائے کوچک میں اپنا رستہ بناتے چلے گئے، وہ بڑے بڑے کھیت جو صدہا سال سے یونانیوں کا پیٹ بھر رہے تھے اب سبزہ زار اور رگیا ہستان میں تبدیل ہو کر رہ گئے تھے، کسان اور کاشتکار جو شاہی سپاہ کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے تھے، قیدی بنا لیے گئے۔ آئندہ دس سال کے اندر سلجوقیوں کی پیش قدمی میں اور اضافہ ہوا، اور پھر اگلے دس سال میں یہ اضافہ اور بڑھ گیا، کم و بیش ایک سو سال کی خدمت میں مملکت بازنطیم کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا۔

لیکن ترکوں میں اب بھی اتنی قوت نہ تھی کہ وہ قسطنطنیہ پہ حملہ کر سکتے، اور اس کی ناقابلِ تسخیر فصیل کو فتح کر لینے کا حوصلہ اپنے اندر پیدا کر سکتے۔

اس مدت میں جو ایک سو سال کے اندر پھیلی ہوئی ہے بہت سے کمزور شہنشاہ مسندِ آرائے حکومت ہوئے جو اپنے ملک اور حکومت کی قوت میں ضعف اور نظامِ مالی میں انتشار و تحلیل کا اور وسائل و ذرائع کی ناکارگی کا سبب بنے،

پھر ایک اور شہنشاہ مسند آرائے حکومت ہوا، یہ نسبتہً قوی تھا، اس میں اتنا حوصلہ تھا کہ ثبات قدم سے مقابلہ کر سکے۔ اگر کھوئے ہوئے علاقے واپس نہ لے سکا تو کم از کم عظمت رفتہ کا کچھ حصہ واپس لینے میں ضرور کامیاب ہو گیا۔ اس شہنشاہ کا نام تھا الیکسیس کومینس[1]، اس کے چار سو سال بعد نوبت قسطنطین پیلیولوگس تک پہنچی۔!

---

[1] ALEXIOS KOMNENOS

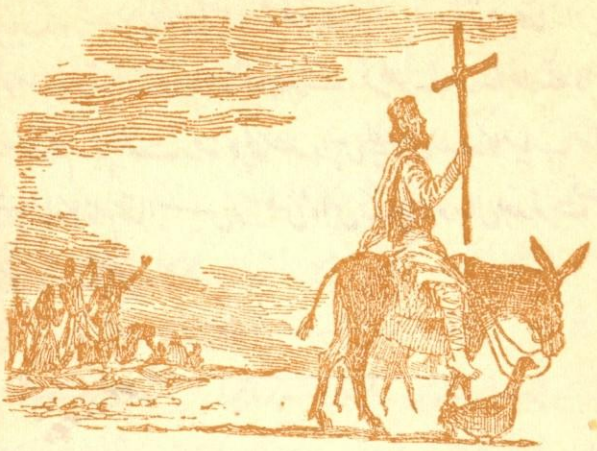

حروبِ صلیبیہ

ترکوں سے جنگ اور مخالفت کے باعث مغربی دنیا نے اپنی پوری توجہ مشرق پر مرکوز کر دی۔ یورپ، جو منچلے نوابوں، اور سر پھرے نائٹوں کا مرکز تھا، اور جو اب تک اپنے جنگلوں، دُور دُور بکھرے ہوئے قلعوں، اور چند شہروں پر قانع تھا۔ اب رفتہ رفتہ عہدِ مظلم کے خوابِ خرگوش سے بیدار ہو رہا تھا، اشرافِ نواح یعنی فرانس، انگلستان، اسپین اور جرمنی کو اپنی قوت کا احساس ہونے لگا

تھا، جنگی قوت رفتہ رفتہ ابھرنے لگی تھی، تجارتی اور کاروباری شہر مثلاً وینس، پی سا اور جنیوا وغیرہ جمہوریتوں کی حیثیت سے نمایاں ہو رہے تھے، کلیسائے روم ظلمت کے تنگنائے سے باہر نکلنے کے لئے قدم بڑھا رہا تھا۔

مذہب گزشتہ چار صدیوں سے، خانقاہوں، صومعوں اور کلیساؤں میں بند تھا، اب اس میں وسعت پیدا ہو رہی تھی، اور وہ ایک نئی زندگی سے روشناس ہو رہا تھا، عظیم الشان اور رفیع المنظر کلیساؤں کی بنیاد یورپ میں پڑ رہی تھی، جو نتیجہ تھی عوام کے ذوق ہنر اور شیفتگیٔ دین کا، تجدید مذہب کا دور صحیح معنیٰ میں شروع ہو گیا تھا۔

محاربات صلیبی کی جنگی تاریخ تقریباً دو سو برس تک پھیلی ہوئی ہے، ——— یہ یورپ کی اس نئی زندگی اور حرکت کا سبب تھے، انہوں نے مسیحیت کا پرچم لہرایا، اور کم از کم وقتی طور پر اس کی مشعل اونچی رکھی۔

بجز چوتھی تباہ کن صلیبی جنگ کے باقی جنگیں ہماری تاریخ کے لئے بہت زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ قسطنطنیہ سے ان کا تعلق ضرور رہے اور تاریخ میں ان کی اہمیت بھی مسلم ہے مگر ان کی اصل اہمیت یہ ہے کہ انہوں نے مشرق اور مغرب کی باہمی تلخی اور کدورت کو غذا دی۔

محاربات صلیبی کا آغاز گیارہویں صدی عیسوی میں ہوا، جب کہ ترک اسلام

قبول کر چکے تھے، ایشیائے کوچک کے بہت سے شہروں پر سلجوقیوں کا قبضہ ہو چکا تھا اور ——— منزی کرت کی خون آشام اور خوفناک جنگ ہو چکی تھی

قسطنطنیہ اب بھی ثروت مند اور طاقتور تھا، لیکن دشمن روز بروز قریب سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا، اب قسطنطنیہ اور ظفر مند ترکوں کے مابین صرف ایک معمولی سی آبی پٹی حائل تھی۔

یہ الیکسیس کومنینس کا دورِ حکومت تھا، یہ شخص حد درجہ قابل اور انتہائی چالاک بھی تھا، وہ ہر طرح دشمن سے گھرا ہوا تھا۔ اسے مدد کی ضرورت تھی ایک روز، گویا تائیدِ غیبی سے اس کی دلی مراد بر آئی، ایک سادی وضع قطع کا آدمی اس کے دربار میں حاضر ہوا، یہ پطرس راہب تھا، جو یورپ کے دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح بیت المقدس کی زیارت کو نکلا تھا۔ یہ بیت المقدس (یروشلم) پہنچا، اور یہ دیکھ کر اسے بہت صدمہ ہوا کہ یہاں کے عیسائی بے دینوں (مسلمانوں) کی رعایا بن کر رہ رہے ہیں، یہاں سے یہ سیدھا قسطنطنیہ پہنچا، اور نہایت بے پروائی کے ساتھ شہنشاہِ اعظم کی موجودگی کو نظر انداز کر کے دلیری اور صفائی سے اپنے مشاہدات و تاثرات بیان کرنے لگا۔

جب شہنشاہ نے اس سیدھے سادے آدمی کے مذہبی تعصب کا یہ رنگ

دیکھا تو اس آگ کو اور ہوا دی، اور بڑے دردناک پیرائے میں بے دینوں (مسلمانوں) کے مظالم کا نہایت لرزہ خیز مرقع اپنی بپتا بیان کرتے ہوئے پیش کر دیا)

پطرس راہب کا بند ضبط ٹوٹ گیا، وہ چیخ پڑا۔

"اعلیحضرت یورپ کے سورماؤں اور رزم آراؤں کو میں آپ کے لئے جمع کر لاؤں گا۔!"

شہنشاہ نے نہایت سنجیدگی سے مجیر و برکت کے طور پر اپنا ہاتھ بلند کیا۔

پطرس یورپ واپس چلا گیا، جس کا مطلب یہ ہے کہ کئی مہینے صرف ہو گیے، کیونکہ اس زمانے میں دقت بھی سست رفتار تھا، اور سفر بھی!

یورپ واپس پہنچنے کے بعد پطرس راہب نے ایک گدھا خریدا، اس پر سوار ہوا، صلیب کو ہاتھ میں لیا، اور شہر بہ شہر، قریہ بہ قریہ مسلمانوں کے خلاف دعوتِ جہاد دینے لگا، وہ اٹلی اور فرانس پہنچا، اور وہاں اپنی آتش بیانی سے آگ لگا دی، کلیساؤں، بازاروں اور عوامی مقامات پر وہ لوگوں کو اپنے گرد جمع کرتا، اور ان کے سامنے بیت المقدس کے عیسائیوں کی زار و زبوں حالت بیان کرتا، وہ ننگے سر، ننگے پاؤں اور معمولی سی چادر میں اپنا نحیف و لاغر بدن لپیٹے رہتا، وہ بہت کم کھاتا، بڑی دیر تک عبادت کرتا اور لوگ از راہِ عقیدت جو روپیہ اُسے دیتے وہ حاجت مندوں میں اُسے تقسیم

کر دینا۔

پطرس کے سامعین شدتِ جذبات سے سسکیاں بھرنے لگتے۔

شہنشاہ الیکسیس کومینس کو پطرس سے بہتر رفیق نہیں مل سکتا تھا، اور نہ پوپ کو اس سے بڑھ کر دلی مراد بر لانے کا کوئی اور موقع مل سکتا تھا، کیونکہ یونانی مغرب سے امداد کے جویا تھے، تاکہ ترکوں کو اپنی سرحد سے پرے دھکیل دیں، اور پوپ کی خواہش تھی کہ یونانی آرتھوڈکس کلیسا، کیتھولک کلیسا کے روما میں مدغم ہو جائے چنانچہ اس نے ان تمام لوگوں کے گناہ معاف کرنے کا اعلان کر دیا جو مسلمانوں بے دینوں سے جہاد کرنے کے لئے بیت المقدس کی طرف قدم بڑھائیں

اس طرح پہلی صلیبی جنگ کا آغاز ہوا۔ مجاہدین صلیب کے قافلوں کی رہنمائی دو رفیقوں کی معیت میں پطرس راہب کر رہا تھا، وہ اپنے خچر پر سوار تھا، ایک طرف بکری تھی، دوسری جانب مرغابی، یہ چیزیں روح القدس کے رمزو نشان کے طور پر استعمال کی گئی تھیں، پطرس کے پیچھے گنہگاران مغرب کی قطاریں تھیں رہزن، لٹیرے، چور، قاتل، زانی، سب گنہگار جو بخشش معصیت کی امید میں آگے بڑھ رہے تھے، ! — لیکن ان میں نیک صالح اور معزز لوگ بھی تھے۔

یہ گروہ بے نوا جو ساٹھ ہزار مرد و زن پر مشتمل تھا، یورپ سے مشرق

کی طرف روانہ ہوا، اس انبوہ کے بہت سے لوگ تکالیف راہ نہ برداشت کر سکے مر گئے، آخر کار جب قسطنطنیہ پہنچے، تو بیمار و ناتوان، بزار و ضعیف، لب گور اور نیم جان، اور ان کی تعداد اب گھٹ کر صرف ۳۰ ہزار رہ گئی تھی، بیس ہزار راستے ہی میں دم توڑ گئے۔

شہنشاہ نے خستہ، درماندہ اور وحشت زدہ انبوہ کو دیکھا، پہلے پہل جو خیال اس کے دماغ میں آیا، وہ یہ تھا کہ ان لوگوں کو فوراً شہر سے باہر نکال دے، چنانچہ بہت جلد اس نے اس مجمع ناپرساں کو باسفورس کے راستے ایشیا بھیج دیا، کچھ مدت بعد یہ مجاہدین صلیبی ایشیا پہنچ گئے، اور فوراً ہی ترک سلطان کی فوجوں نے ان پر دھاوا بول دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب ہلاک ہو گئے اگر کوئی چیز بچی تو وہ ہلاک شدگان کی ہڈیوں کا انبار تھا۔

پطرس قسطنطنیہ میں مقیم تھا، اس نے باقی ماندہ زندگی وہیں گزار دی، یہاں اس کی حیثیت ایسے دیوانے کی تھی، جو خطرناک نہ تھا

لیکن یہ مختصر سا وقفہ حقیقی صلیبی جنگ کا پیش خیمہ تھا، بہت جلد نقل و حرکت کا سلسلہ شروع ہو گیا، ہر سال جنگ جو اور رزم آزما زائروں کے دستے بیت المقدس پہنچنے لگے، ان میں کچھ لوگ واقعی مقدس تھے لیکن زیادہ تر مہم جو یا لالچی، کئی نسلوں تک مغرب سے مشرق کی طرف مجاہدین صلیب کی تگ و تاز کا سلسلہ جاری رہا۔

پطرس راہب کے غیر منظم لشکر کے بعد ۱۰۹۶ء میں یورپ کے نامور سردار اور اشراف اپنے خدم و حشم کے ساتھ میدان جہاد کی طرف روانہ ہوئے - یہ زبردست اور پیکار آشنا فوج تھی، لیکن یونانیوں کی خوش بختی یہ تھی کہ یہ مغربی اشراف و امراء یورپ کے جنگلوں سے نکل کر جب یہاں پہنچے تو قسطنطنیہ کی ثروت اور شہنشاہ کی عظمت سے مرعوب ہو گیے۔

الیکسیس کومنینس نے ان زوار دوں کا خیر مقدم کیا، اس کی بلند و بالا شخصیت، باوقار اور شائستہ انداز، زرنگار اور زرکار لباس دیکھ کر ان کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں، اس کی خسروی جواہرات اور موتیوں سے آراستہ اونچی کلاہ زیب سر تھی، ریش دراز قرمزی رنگ میں رنگی ہوئی اور اس میں خم پڑے ہوئے، مصنوعی پرندے بالائے سر سرود خواں، اس کا تخت کہربائی، آہستہ آہستہ ان کی چشم حیرت کے سامنے ہوا میں (خفیہ کمانیوں اور کلوں کی مدد سے) اٹھ رہا تھا۔

یورپ کے اشراف و امراء، منہ کھولے تصویر حیرت بنے یہ منظر دیکھ دیکھ کر مرعوب ہو رہے تھے وہ محسوس کر رہے تھے کہ کسی دیوتا کے حضور میں حاضر ہیں، ضرورت تھی کہ الیکسیس فریب اور حیلہ گری سے کام لیتا، وہ یورپ

لہ ۴۹۱ھ

کے ان نو وارد سرداروں کو نہ دوست سمجھتا تھا، نہ اچھی نظر سے دیکھتا تھا، نہ اسے ان کا داڑھی مونچھ صاف چہرہ پسند تھا، نہ گھوڑوں کی بدبو، وہ ان پر ذرا بھی اعتماد نہ کرتا تھا، لیکن اسے ترکوں کے مقابلے میں ان کی مدد کی بھی ضرورت تھی، چنانچہ اس نے اظہار تملق میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی، خوب انعام دئے، آئندہ کام لینے اور مزید رشوت کے وعدے کیے، سبز باغ دکھائے اور انجام کار ان کے پیشروؤں کی طرح انہیں بھی باسفورس کے ایشیائی حصے میں پہنچا دیا۔

اس مرتبہ کی یہ چال سود مند ثابت ہوئی، اس مرتبہ عیسائی مجاہدوں کا قتل عام نہیں ہوا، لڑائی ہوئی اور شہنشاہ اپنے چھنے ہوئے علاقے کا معقول حصہ واپس لینے میں کامیاب ہو گیا جس کے بارے میں مایوسی تھی کہ اب ترکوں سے واپس نہیں لیا جا سکتا۔

اس کے بعد دو سو سال سے زیادہ مدت تک ایک کے بعد دوسری صلیبی جنگ کا سلسلہ جاری رہا، مشرق و مغرب میں مسلسل آویزش . . . . . جاری رہی۔

ایک جنگ صلیبی میں ایشیائے کوچک کا بڑا حصہ مسخر ہو گیا، اور بیت المقدس بھی عیسائیوں کے قبضے میں آ گیا، لیکن مجاہدین صلیبی اسے قبضے میں رکھنے کی صلاحیت سے محروم تھے۔ یورپ کے مرطوب اور سرد فضا میں رہنے والے، یہ جنگی مرد یہاں آ کر بہت جلد کمزور ہو گئے، اور یہاں کے عیش و نعم کے خوگر ہو گئے، مسالے دار شامی کھانے، گرم جذبات انگیز آب و ہوا، ان چیزوں

نے انہیں آرام طلب بنادیا ، رفتہ رفتہ وہ شوقِ رزم آرائی سے محروم ہوگیے ۔

ترکوں کو مہلت درکار تھی ، وہ مل گئی ، ایک صدی کا تین چوتھائی حصّہ گذر گیا ، کہ صلاح الدین نمودار ہوا ، ترک سلاطین میں سب سے زیادہ عظیم و جلیل، ۱۱۸۷ء میں اس نے بیت المقدس عیسائیوں سے پھر چھین لیا - اور اس کے بعد ایک ایک کرکے بہت سے شہر ترکوں کے قبضے میں آگیے ، اور بہت جلد وہ دن بھی آگیا کہ سارا مشرق ٹائیگرس[ل] سے لے کر نیل تک بے دینوں (مسلمانوں) کے قبضے اور تصرف میں آگیا ۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ مغرب صلیبی جنگ کی روح سے پورے طور پر بیگانہ ہو چکا تھا ، پوپ کی ہمت نہ تھی کہ جنگ کی بات زبان پر لائے ، یہ سب اب پورے طور پر سیاست دانوں اور تاجروں کے ہاتھ میں تھے ۔ "جہادِ صلیب" کا لفظ صرف حرص و آز کا پردہ رہ گیا تھا ، اب نہ شوقِ جہاد تھا ، نہ دفعِ کفار (مسلمان) کا جذبہ ، اب تو مجاہدین صلیب مسلمانوں سے تجارت اور کاروبار کر رہے تھے ۔

ل (دجلہ) Tigris

چوتھی صلیبی جنگ کی ہیئت

قسطنطنیہ کی تاریخ میں چوتھی صلیبی جنگ غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے۔ جو حالات اس کا سبب بنے، ایک حد تک مبہم سے ہیں، لیکن جہاں تک نتیجے کا تعلق ہے وہ نہایت صاف اور واضح ہے۔

۱۲۰۲ء میں قسطنطنیہ کا فرماں روا شہنشاہ آئزک اینجلوس[1] معزول کر دیا گیا

---

[1] ISSAC ANGELOS

اور ایک غاصب تخت نشین ہوگیا، آئزک کے لڑکے نے باپ کو تخت واپس دلانے کے لئے یورپ کا سفر کیا، کہ لاطینیوں کو اس کی مدد پر مائل کرے، اس نے وعدہ کیا کہ اگر اس کا باپ دوبارہ تخت نشین ہوگیا، تو بہت بڑی رقم عطا کرے گا، علاوہ ازیں بیت المقدس فتح کرنے کے لئے فوج بھی دے گا، اور ایک مستقل فوج اس کے حفظ و دفاع کے لئے مقرر کردے گا۔

یہ خوش خبری سنتے ہی ڈیوک بیران اور نائٹ ایک نئی مہم میں حصہ لینے کے لئے تیار ہوگیے۔ وینس کا نوے سالہ صدر جمہوریہ ڈانڈولو[1] جو حد درجہ حیلہ ساز آدمی تھا، جوشِ مسرت سے بے خود ہوگیا، وینس کے لوگوں کو مشرق میں اپنی تجارت کے فروغ کے لئے زیادہ سے زیادہ بندرگاہوں کی ضرورت تھی یہ بہترین موقع ان کے ہاتھ آگیا تھا۔

مجاہدین صلیب کی خواہش تھی کہ وینس کے جہازوں پر سوار ہوکر بیت المقدس کا رُخ کریں اور وینس والے یہ چاہتے تھے کہ بازنطینی مملکت کے قلب قسطنطنیہ میں مستقل طور پر سے لنگر انداز ہوں، انہیں جہاد صلیب یا بیت المقدس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی وینس کے جہازوں کا ایک بیڑا چالیس ہزار مضبوط اور مسلح جنگ آزماؤں کو لے کر قسطنطنیہ کے دروازے پر پہنچ گیا، ان مجاہدین صلیب نے نئے شہنشاہ کو تخت سے اتار پھینکا، آئزک انجلوس کو جو اب اندھا ہوچکا تھا، قید خانے سے لائے اور تخت پر بٹھا دیا اور پھر موعودہ انعام کا انتظار کرنے لگے۔

---

[1] DANDOLO

وہ پانچ مہینے تک انتظار کرتے رہے۔ آئزک کے بیٹے کے پاس نہ روپیہ تھا نہ سپاہ، مگر مغربی مجاہدین تھے کہ جم کر بیٹھ گیے، اور مزید شدت کے ساتھ مطالبہ کرنے لگے،

لاطینی فصیل شہر کے باہر اور فصیل شہر کے اندر ڈیرے ڈالے پڑے تھے۔ اور یونانی اندرون شہر ناشکیبائی کے عالم میں پیچ و تاب کھا رہے تھے۔

اب نوبت یہ پہنچی کہ ملاح اور سپاہی بیکار اور فتنہ گر بنے ہوئے تھے، اور یونانی سہمے ہوئے اور پریشان حال باہمی اعتماد اٹھ گیا تھا، اس کی جگہ نفرت اور بیزاری نے لے لی تھی، اور یہ روز بروز سخت اور ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی، اور اس وقت تو یہ نقطۂ عروج پر پہنچ گئی جب آئزک اور اس کے بیٹے نے انہیں ادا کرنے کے لئے رقم کا اور نکال باہر کرنے کے لئے سپاہ کا انتظام کرنے سے عاجز آکر کلیسا کے خزانے سے ان تکلیف دہ اتحادیوں کے تعاون کی قیمت ادا کرنی چاہی، جہاں تک یونانی قوم کا معاملہ تھا، یہ انتہا تھی اس سے زیادہ برداشت کرنا ان کے لئے ناممکن تھا۔ انہوں نے لاطینیوں سے علی الاعلان نفرت، برہمی اور حقارت کا برتاؤ کرنا شروع کر دیا، اور پھر نوبت یہاں تک پہنچی کہ فصیل شہر کے اندر کوئی یورپین مجاہد صلیب ایسا نہ تھا، جو ذبح نہ کر دیا گیا ہو، آئزک دہشت کے باعث مر گیا، اس کا بیٹا گھونٹ کر ہلاک کر دیا گیا، اور فوج کے ایک افسر کو شہنشاہ بنا دیا گیا۔

شہر کی افراتفری اور ڈانڈولو کی ترغیب سے متاثر ہو کر مجاہدین صلیب نے اس غیر منظم اور کمزور شہر پر حملہ کر دیا۔

خشکی کی طرف سے شہر کا دفاع اچھی طرح ہو سکتا تھا، اور مردمانِ شہر بخوبی حملہ آوروں کو روک سکتے تھے، وینس کے ملاحوں نے دریا کی طرف سے لاطینیوں کو فصیل تک پہنچانے کی کوشش کی کہ رہ زن کر کے داخل ہو جائیں اس طرح بڑی آسانی سے کچھ لوگ شہر میں داخل ہو گیے، اور اندر داخل ہوتے ہی انہوں نے پھاٹک کھول دیئے کہ پوری لاطینی سپاہ گھس آئے۔

فوجی افسر جو شہنشاہ بن بیٹھا تھا، اس صورت حالات کی تاب نہ لا سکا، اور بھاگ کھڑا ہوا، اسی طرح دو تہائی باشندگانِ شہر بھی گھر بار چھوڑ کر نکل جانے پر مجبور ہو گیے۔ یہ واقعہ ۱۲ اپریل ۱۲۰۴ء کا ہے۔

کامل تین دن تک لاطینی سپاہ نے شہر میں قتل و غارت کا بازار گرم رکھا۔ ——— قسطنطنیہ تاراج ہو گیا، پوپ انوسنٹ سوم[1] نے اپنے تخت سے اپنے پیروؤں کی اس حرکت شنیعہ پر سخت ناراضی اور برہمی کا اظہار کیا، اور سرزنش کرتے ہوئے فرمایا کہ "مشرق اور مغرب میں دوستی کا امکان ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا"۔

---

[1] POPE INNOCENT III

مجاہدین صلیب مدت ہوئی کہ بیت المقدس اور پوپ سے کیے ہوئے اپنے عہد مقدس کو فراموش کر چکے تھے۔ انہوں نے کلیساؤں کا مال و زر لوٹ لیا، اور اپنے گھوڑے سانتا صوفیا میں باندھے، راہبات کو بدمستی اور ہوس کا شکار بنایا، راہبوں اور پادریوں کو نشانۂ ستم بنایا۔

یورپین مجاہدین صلیب نے وہ سب کچھ غارت کر دیا، جس میں زیبائی اور خوبی تھی،!

قدیم یونانی مجسمے اکھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دیئے گیے، تمام کتب خانوں کی کتابیں لشکر میں لا کر جلا دی گئیں، شہنشاہوں کے مقبروں سے دھاتوں کی بنی ہوئی تمام چیزیں اکھاڑ لی گئیں، شہر کے سب سے بڑے میدان میں سنگ مرمر کی جو چیزیں تھیں ان سب کو مجاہدین صلیب نے ہتھوڑوں اور کلہاڑیوں سے توڑ پھوڑ کر بیکار اور رائیگاں کر دیا، تانبے اور پیتل کی جو چیزیں تھیں، انہیں گلا کر معمولی قیمت کے سکے ڈھال لیے۔ یہی وقت تھا جب مشہور چہار اسپہ زریں ——— جن کا ذکر گزر چکا ہے ——— یہاں سے چرا کر وینس پہنچا دیئے گیے۔

ان کاموں سے فارغ ہونے کے بعد یہ مغربی فاتح جو مجاہد صلیب تھے اپنی سواریاں اور گاڑیاں قصر بلاچرنی میں لے آئے۔ یہی وجہ تھی کہ شہنشاہ قسطنطین پیلیولوگس کو قصر کے جس کمرے میں ہم نے کھڑے دیکھا تھا، اس کا فرنیچر تک

خستہ تھا، اور دیواریں ننگی،!

اس کے بعد مجاہدینِ صلیب نے آگ لگادی، جو آٹھ روز تک بھڑکتی رہی، اور ڈھائی میل کے رقبے میں تباہیاں پھیلاتی رہی، اس طرح دنیا کا سب سے زیادہ مہذب، سب سے زیادہ دولت مند اور سب سے زیادہ خوبصورت شہر —— قسطنطنیہ —— تیرہ بختی کا شکار ہوگیا۔

کسی ترک نے نہ اس حادثۂ فاجعہ سے پہلے نہ اس کے بعد، کسی مفتوح شہر میں قتل و غارت، تباہی و بربادی کا وہ نمونہ پیش کیا، جو فرانسیسی اطالوی، اور دوسرے یورپین، پیروانِ صلیب، نے، مسیحی قسطنطنیہ میں کر دکھایا، تین شبانہ روز کی یہ بے رحمانہ ہوس رانیاں اور لوٹ مار کے واقعات ہمیشہ ہمیشہ کے لئے، مشرق کے حاشیۂ قلب پر مرتسم ہوگیے۔

چالیس سال کے بعد پراگندہ اور منتشر یونانی پھر سے مجتمع ہونے شروع ہوئے، اس مرتبہ جنوی حکومت نے ان کی مدد کی، کیونکہ وہ وینس کی حکومت سے رقابت رکھتی تھی، اور اس کی یہ کامرانی اسے ایک آنکھ نہ بھاتی تھی ایشیائے کوچک کے قریبی شہر انہوں نے واپس لے لیے، اور ۱۲۶۱ء میں شہنشاہ مائیکل ہشتم کی سالاری میں انہوں نے از سرِ نو قسطنطنیہ پر بھی قبضہ کرلیا

ے MICHAELVIII

لیکن وہ عظمتِ رفتہ پھر کبھی نہ واپس آ سکی، قسطنطنیہ کی ہر چیز، اس کا حسن، رعنائی اور دولت چھن چکی تھی، اب اس کی حیثیت بن ثروت کی تھی، وینس کے غارت گر جنہوں نے قسطنطنیہ کی تجارت، جہاز رانی، اور صنعت کو لوٹ لیا تھا، اب بھی قریب کے جزیروں میں مقیم تھے، بلکہ خاصی تعداد میں شہر کے اندر موجود تھے۔

جنوی جنہوں نے یونانیوں کی قسطنطنیہ کے واپس لینے میں مدد کی تھی، غلطہ[1] میں مقیم تھے، جو شاخ زریں سے بہت قریب تھا، یہاں انہوں نے گویا اپنا ایک شہر بسا لیا تھا ——— قسطنطنیہ اپنی عظمت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم ہو چکا تھا۔

اس حادثے نے صلیبی جنگ میں شرکت کے شوق کو اس خطے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مردہ کر دیا۔ سارا ایشیا اس زمانے میں یورپی تسلط کے تحت آ گیا۔ اگر ماضی قریب کے لرزہ خیز واقعات رونما نہ ہوئے ہوتے، تو سپاہ مغربی یہاں قدم بھی نہ رکھ سکتی تھی، بعد میں ڈھائی صدی کی مدت کے اندر یورپ اس سرزمین میں جہاں اس نے اتنی شدید جنگ کی تھی، ایک انچ زمین بھی اپنے قبضے میں نہ رکھ سکا۔ مزید برآں مشرق کی جانب پہلی صلیبی

---

[1] GALATA

جنگ کے موقع پر گیارہویں صدی میں جو پیش قدمی شروع ہوئی تھی، اسے چوتھی صلیبی جنگ کے مجاہدوں نے پورے طور پر رائیگاں اور درہم برہم کر دیا۔

وہ سیاسی مہم جنہوں ۱۲۰۴ء میں بازنطینی شہنشاہیت کو تاراج اور تباہ کیا، درحقیقت وہی دو سو سال بعد مسلمانوں کے ہاتھوں سقوطِ قسطنطنیہ کے ذمہ دار ہیں اور ساتھ ہی ساتھ مشرق میں مسیحیت کے خاتمے کے بھی!

دشمن سامنے آتا ہے

اگر لاطینی اور یونانی یا دوسرے الفاظ میں مغرب و مشرق، مسلمانوں کے خلاف متحد ہو جاتے تو بہت ممکن تھا، کہ دشمن پر غالب آجاتے، لیکن حالت یہ تھی کہ مغرب و مشرق باہمی طور پر ایک دوسرے سے جتنے بدگمان

اور اندیشہ مند تھے اپنے مشترک دشمن سے (مسلمان) اسے
بھی نہیں تھے، اور اب وقت نکل چکا تھا،
ایشیا سے ایک نئی قوت ابھر رہی تھی جس
نے مسلمانوں میں ایک نئی روح پیدا کر دی!"

چنگیز خاں، تاتار باء ایشیا، طغیان و خروش کے نقطۂ عروج پر پہنچ چکا تھا ٹھیک اس وقت جب یورپین قسطنطنیہ پر قبضہ کر رہے تھے، چنگیز نے پوری خون آشامی کے ساتھ یلغارِ بے پناہ کا سلسلہ شروع کر دیا، اور سارے ایشیاء کو مغرب سے لے کر مشرق تک روند ڈالا، ساری دنیا اس کی سفاکی سے لرزہ بر اندام ہو رہی تھی، لیکن ہمارا موضوع ایک خاص قبیلے پر چنگیز خاں کے اثرات کا بیان کرنا ہے۔ اس مرتبہ ایشیائی آپس میں برسرِ پیکار تھے۔

مغرب پر تاخت و تاراج کرنے کے لیے مغلوں نے یکے بعد دیگرے بہت سے قبیلوں کو زیر کر لیا، ان میں جو جنگ جو اور طاقتور لوگ تھے، انہیں اپنی فوج میں شریک کر لیا، جنہیں ناکارہ سمجھا . . . غلام بنا لیا، لیکن ایک قبیلہ ایسا تھا، جو کسی طرح زیر نہ ہوا، کسی طرح ہاتھ نہ آیا، وہ ہمیشہ ان کے آگے آگے رواں دواں رہتا، کبھی مفتوح نہ ہو سکا، اس قبیلے کے لوگ بڑے اچھے سوار، تنومند اور انتہائی دلیر تھے، عورتیں، بچے، بوڑھے، غلام، مویشی ـــــ اور ـــــ ایک پوری کی پوری قوم رواں دواں تھی جس

کی حفاظت قبیلے کے جنگ جو لوگ کرتے تھے ایغز کوں کا ایک نیا قبیلہ تھا۔ مغل جس کا شدت سے تعاقب کر رہے تھے مغربی علاقے میں اس ترک قبیلے نے دریائے فرات کو عبور کر لیا، ———— یہی قبیلہ بعد میں ترکان آل عثمان کے نام سے مشہور ہوا۔

یہ نام انہوں نے اپنے سردار عثمان کے نام سے مستعار لیا، یہ بہت بڑا جنگ جو تھا، چمک دار آنکھیں اور لہراتی ہوئی ریش، حسن مردانہ کا پر شکوہ نمونہ بجا طور پر اُسے بابائے قبیلہ کے نام سے یاد کیا جا سکتا تھا، جب یہ گھوڑے پہ سوار ہو کر وسعت صحرا سے گزرتا تو اس کی لمبی اونی عبا شانوں پر لہرا رہی ہوتی ردا کی آستیں ڈھیلی رہتیں، تاکہ ہاتھ آزاد رہ سکیں، پاؤں برہنہ اور شلوار ڈھیلی، جنگ جو ترکوں کا یہ مثالی نمونہ تھا۔

ایک مرتبہ عثمان نے خواب میں ایک بہت بڑا درخت دیکھا، جس کے سائے تلے دنیا کا ایک بہت بڑا حصہ آگیا، اس کے نیچے آپس میں ملے ہوئے چار بڑے پہاڑ تھے، اور ان پہاڑوں کے نیچے سے چار بڑے بڑے دریا دجلہ، فرات، نیل، اور ڈینوب رواں تھے، ان پہاڑوں اور درختوں کے اوپر سے اس نے مؤذن کی صدا سنی، جو لوگوں کو نماز کی دعوت دے رہا تھا اس خواب سے اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ سارے علاقے ایک دن مسلمان ہو جائیں گے، اتنے میں خواب ہی کے عالم میں کیا دیکھتا ہے کہ بڑے زور

کی آندھی چلی اور جھکڑ کے زور سے مذکورہ درخت کی ساری پتیوں کا رخ سمرے قسطنطنیہ ہو گیا۔

۱۳۰۰ء میں عثمان نے سلطان کا لقب اختیار کیا، اس نے گھوڑے کی دُم کو اپنی فوج کے پرچم کا نشان قرار دیا، اس پرچم اور نشان کا حامل کوئی بڑا سردار ——— پاشا ——— ہی ہو سکتا تھا، آیا عثمان نے واقعی کوئی خواب دیکھا، یا یہ محض ایک کہانی ہے؟ اس سے بحث نہیں، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسی دن سے مسلمان سلاطین کی حیثیت سے ترکوں نے مذکورہ سرزمین پر فرماں روائی کے سلسلے کا آغاز کر دیا، عثمان کی ذات سے سلاطین کا جو سلسلہ شروع ہوا، وہ ہمارے زمانے تک قائم رہا، اور یہ فرماں روائی اب تک قائم ہے۔

۱۳۲۶ء میں ترکان عثمان نے بروصہ[1] پر قبضہ کر لیا، جو ایشیائے کوچک میں سب سے بڑا مسیحی شہر تھا، اور اس کے بعد سے ایشیائے کوچک پر تابڑ توڑ حملوں کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے تو یہ اس وقت رکا جب مارمورا اور باسفورس کے تمام ایشیائی ساحل ترکوں کے ہو گئے۔

لیکن ایشیاء کی تسخیر کے باوجود ترکوں کا شوق کشور کشائی کم نہ ہوا، اس کے بعد

---

[1] BRUSA

انہوں نے درۂ دانیال[1] کو عبور کیا، اور شمال کی طرف یعنی نواح بلقان کی جانب بڑھنے لگے، یہاں شہر ادرنہ[2] (ایڈریانوپل) کو قسطنطنیہ کے بعد سلطنت کا مضبوط ترین شہر اور اپنا یورپی پائے تخت بنایا۔

اب صورتِ حال یہ تھی کہ حکومتِ عثمانی شمال اور جنوب دونوں طرف سے قسطنطنیہ کے بہت قریب آگئی تھی۔

ناامیدی اور مایوسی کے عالم میں یونانی سودا کرنے پر تیار ہو گئے، چنانچہ انہوں نے تجویز پیش کی کہ شہنشاہ قسطنطنیہ کی لڑکیوں کی شادی سلطان کے لڑکوں سے کر دی جائے، معاملات یہاں تک پہنچ گئے کہ ایک مرتبہ شہنشاہ قسطنطنیہ کے فرزند نے سلطان کے بیٹے سے سازش کی کہ ہم دونوں اپنے اپنے باپ کو معزول کر دیں، اور خود تختِ حکومت پر متمکن ہو جائیں، لیکن سلطان کو سازش کا پتہ چل گیا اور اس نے اپنے بیٹے کو قتل کر دیا، اسی طرح شہنشاہ قسطنطنیہ نے اپنے بیٹے کو اندھا کر کے قید کر دیا۔

حالات نے جو صورت اختیار کر لی یہ تھی کہ اب کوئی مفاہمت اور توافق کی صورت باقی نہیں رہ گئی تھی، اب تک ہر دو طرف سے باقاعدہ اعلانِ جنگ

---

[1] HELLESPONT

[2] ADREANOPLE (ADIRNE)

نہیں ہوا تھا، لیکن چھیڑ چھاڑ اور نوک جھونک کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا ترکوں کی ہر فتح کے بعد قسطنطنیہ کے سہمے ہوئے باشندوں کے کان حملہ آوروں کے گھوڑوں کی ٹاپوں پر لگ جاتے۔

۱۴۰۲ء میں ترکوں کے گھوڑوں کی آوازِ سُم قسطنطنیہ میں سنی گئی۔

اس زمانے میں ترکوں کا سلطان 'بایزید تھا جو "صاعقہ" کے لقب سے مشہور تھا، کیوں کہ اس کا حملہ ہمیشہ تند اور فیصلہ کن ہوتا تھا۔

درجنوں چھوٹی بڑی فتوحات کے بعد بایزید کے دل میں شہروں کی ملکہ قسطنطنیہ کو فتح کرنے کی آرزو مچلی، شہنشاہ نے کوشش کی کہ خراج کی پیش کش کر کے اور اپنے مقدس آرتھوڈکس کیتھولک شہر میں ایک مسجد تعمیر کر کے اس ارادے سے باز رکھے، لیکن "صاعقہ" نے اس کا جواب قہقہے سے دیا۔

یہ ہماری اصل کہانی یعنی سقوطِ قسطنطنیہ سے پچاس سال پہلے کا واقعہ ہے۔ بوڑھے فرانزا کو اپنے بچپن کا یہ واقعہ یاد تھا، اسے مردانِ قسطنطنیہ کے دہشت انگیز چہرے بھی یاد تھے، —————— لیکن مکمل تباہی اور بربادی اب سر پر منڈلا رہی تھی —!

لیکن قبل اس کے کہ یہ مہلک حادثہ پیش آتا اور قبل اس کے کہ مکمل تباہی اور بربادی سے دوچار ہونا پڑتا، قسطنطنیہ معجزانہ طور پر بچ گیا۔

قسطنطنیہ کی یہ نجات عیسائیوں کی امداد و تعاون کا نتیجہ نہیں تھی، بلکہ مشرق

کی ایک اور خونخوار شخصیت ـــــ تیمور لنگ ـــــ کے باعث ۔

تیمور قوم تاتار کا ایک فرد تھا، یہ چنگیز خاں کی نسل سے تھا، اور کسی طرح اپنے جدّ (چنگیز) سے کم نہ تھا۔ چودھویں صدی عیسوی کے وسط میں تیمور سمرقند سے دنیا کو فتح کرنے کے ارادے سے نکلا، وہ موت کو بکھیرتا اور تباہی پھیلاتا ہر گوشۂ ارض کی طرف گیا، ایران، روس، سائبیریا، چین اور ہندوستان کوئی ملک اس نے نہیں چھوڑا، جہاں گیا عمارتیں ڈھا دیں، شہر جلا دیئے، سارا مال و متاع لوٹ لیا، اور اب وہ ایک لشکرِ گراں کے ساتھ، ایشیائے کوچک کی طرف بڑھ رہا تھا۔

تیمور سفید مو، پالنگ، اور زشت منظر تھا، لیکن دنیا اس کے نام سے لرزتی تھی، اس کا شعار یہ تھا کہ "نہ کبھی پشیمان ہونا چاہیئے، نہ کبھی افسوس کرنا چاہیئے"۔ سفاکی اور خوں ریزی کے اس عام دور میں تیمور کی خون آشامی اور ستم گری سب سے بازی لے گئی تھی۔

بایزید نے لاف زنی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "میں تیمور سے مقابلہ کروں گا" اور ایک لاکھ بیس ہزار کا لشکر لے کر اس کے مقابلے کو نکلا، تیمور کی فوج تین لاکھ سپاہیوں پر مشتمل تھی، جس میں ۳۲ ہندوستانی ہاتھی بھی تھے، ان ہاتھیوں کو دیکھ کر ترکی گھوڑے بھڑک گئے، لیکن بایزید ڈٹ کر مقابلہ کرتا رہا جب تک اس کا ایک ایک آدمی میدان جنگ میں ذبح نہ ہو گیا، پھر جب وہ اپنے گھوڑے

کو موڑ رہا تھا، کہ گر پڑا، مغل اس پر ٹوٹ پڑے اور گھسیٹتے ہوئے نشانِ فتح کے طور پر تیمور کے پاس لے گئے۔

بایزید کو تیمور نے ایک آہنی پنجرے میں قید کر دیا، اور آٹھ مہینے تک شہر بہ شہر گھماتا رہا، ہر نئی فتح کے موقع پر اس کی نمائش ضرور کی جاتی تھی۔

آٹھ مہینے کے بعد بایزید کا انتقال ہو گیا، عثمانی ترکوں کا شیرازہ بکھر گیا، اور تاتاری بھیڑیوں کی طرح ایشیائے میں خون کی ندیاں بہانے لگے۔ اب ان کی نظریں چین پر پڑ رہی تھیں۔ بایزید سے جو معرکہ آرائی ہوئی تھی، اسے وہ کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔

مجاہدین صلیب کی طرح تیمور لنگ نے ایشیائے کوچک میں کشت و خون اور مار دھاڑ کے سوا کچھ نہ کیا، لیکن اچانک ظہور سے قسطنطنیہ کو سانس لینے کا موقع مل گیا، بجائے اس کے کہ بایزید کے ہاتھوں میں جاتا ابھی تک وہ اپنی فصیل کے اندر زندہ تھا، لیکن لرزاں۔

وقتی طور پر ترکانِ عثمانی پورے طور پر مٹ گئے۔

لیکن قسمت کے عطا کیے ہوئے اس نادر موقع سے عیسائیوں نے کیا فائدہ اٹھایا؟

عین اس وقت جب تیمور بایزید سے مصروفِ جنگ تھا جنوبی باشندوں نے جو غلطہ (قسطنطنیہ کا بایاں بازو) میں مقیم تھے، ترکوں سے شرائط طے کیے

کہ انہیں اپنی کشتیوں میں بٹھا کر ایشیائے کوچک سے یورپ پہنچا دیں، اور معقول قیمت لے کر انہوں نے ایسا کیا بھی، اس طرح وینس والے بھی جہاں روپے کا معاملہ ہو پیچھے نہیں رہ سکتے تھے، انہوں نے بھی اس "تجارت" میں مقابلہ شروع کر دیا، انہوں نے منہ مانگے دام لے کر ترکوں کی بہت بڑی تعداد کو اپنی کشتیوں میں بٹھا کر جہاں کہا گیا، پہنچا دیا۔ بلکہ واقعہ تو یہ ہے اور اس کا اعتراف کیے بغیر چارہ نہیں کہ خود قسطنطنیہ میں بعض زر پرست یونانیوں نے بھی اس تجارت میں حصہ لیا۔

اس طرح عثمانی گروہ کا بچا کھچا حصہ مرنے سے محفوظ رہ گیا،

ان شکست خوردہ عثمانی ترکوں کے درمیان ایک نیا سلطان ——— سلطان محمد اوّل ——— نمودار ہوا، یہ نہایت معتدل مزاج، روادار، اور باہمت شخص تھا، اس نے ترکوں میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی، بڑی خاموشی سے، لیکن بڑے ضبط و نظم کے ساتھ، اس نے فوج کو از سر نو ترتیب دیا، اور اپنے سپاہیوں میں ہمت تازہ پیدا کر دی، چالیس سال تک محمد اوّل اور اس کے جانشین اپنی قوم کی تعمیر نو میں مصروف رہے، انہوں نے ایشیائے کوچک کے اپنے چھنے ہوئے مقبوضات کا بڑا حصہ واپس لے لیا، اور ایک مرتبہ پھر قسطنطنیہ پر حملہ کرنے کی تدبیر کرنے لگے۔

اب سلطان محمد اوّل کا جانشین اس کا پوتا سلطان محمد ثانی تھا، اس کی نشست

طبعی کے باوجود یہ حقیقت تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ اس کا شمار دنیا کے کامیاب ترین فوجی جنرلوں میں ہونا چاہیئے، کوئی شبہ نہیں فوجی تاریخ میں اسے وہی مرتبہ حاصل ہے، جو سکندر اعظم اور نپولین کو حاصل ہے۔

یہ تھا وہ شخص جس کا وزیر اعظم خلیل پاشا تھا، اور جسے ہم شہنشاہ قسطنطنیہ قسطنطین پیلیولوگس کے دربار خاص میں دیکھ چکے ہیں۔

سلطان محمد ثانی کا باپ، سلطان مراد یونانیوں کا دوست تھا، دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیئے کہ وہ یونانیوں کا دشمن نہ تھا، وہ بلقان میں مصروف جنگ تھا اور تیمور کی غارت گری اور خون آشامی کے نقصانات کی تلافی میں لگا ہوا تھا اس کے پاس اتنا وقت ہی نہ تھا کہ قسطنطنیہ کے بارے میں سوچتا۔

لیکن سلطان محمد ثانی، جب اس نے اپنے پائے تخت اور نہ سے جنوب کی طرف نظر ڈالی، تو اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک پیدا ہو گئی، سلطان بننے کے ایک ہی سال بعد قسطنطنیہ کے شمال میں چھ میل کے فاصلے پر، اور باسفورس کے کنارے پر واقع درۂ رومیلی حصار کو مضبوط و مستحکم بنانے کا کام زور شور سے شروع کر دیا۔ "جو فیصلہ قسطنطنیہ فتح کرے گا، جنت میں جائے گا۔"[1]

---

[1] اس بیان کی وضاحت قبل ازیں کی جا چکی ہے (مترجم)

آغاز اسلام کے کچھ عرصے بعد عربوں نے کوشش
کی تھی کہ قسطنطنیہ کو فتح کر لیں، سلجوقی ترکوں نے
بھی یہ کوشش کی، یورپین مجاہدین صلیب صرف
کسی حد تک اس مقصد میں کامیاب ہو سکے،
لیکن اب .....!"

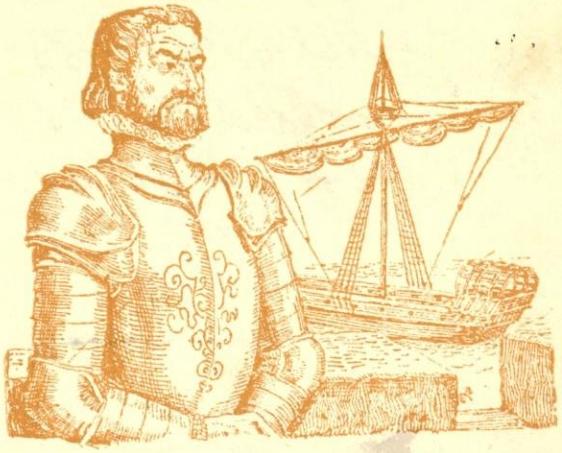

یونانیوں کی جنگی تیاریاں

خلیل پاشا سے گفتگو کرنے کے بعد شہنشاہ رات بھر نہ سو سکا۔ صبح صبح ایک مرتبہ پھر مریم عذرا کی تصویر کے سامنے دوزانو ہو گیا اور پھر چشم خیرہ سے شہر کی طرف دیکھنے لگا، سانتا صوفیا کے گنبد پر زرد رنگ کی دھوپ پڑ رہی تھی، اور شاخ زریں کا یہ سکون پانی دھات کی طرح چمک رہا تھا۔ پھر اس نے اپنی حکومت کے دو ذمہ دار افسروں کو طلب کیا۔ یہ وہ لوگ تھے جن پر

اسے غیر معمولی طور پر اعتماد تھا۔

قصرِ بلاچرنی میں تختِ شاہی پر شہنشاہ رونق افروز تھا، سینہ تنا ہوا اور گردن اوپر کو اٹھی ہوئی، اس نے ان لوگوں کو کچھ رسمی ہدایات دیں، پرچم ہاتھ میں لیے، مخملی اور سمور کے شاندار عبا میں ملبوس یہ دونوں شاہی معتمد سامنے تھے یہ دونوں سفیر کی حیثیت سے ۱۵۰ میل دور اورنہ جا رہے تھے، کہ سلطان محمد ثانی کی خدمت میں شرف باریابی حاصل کر کے، معروضات پیش کریں وہ شہنشاہ کی طرف سے سلطان کی خدمت میں اس بات پر احتجاج کرنے جا رہے تھے کہ وہ ایک نیا قلعہ تعمیر کر کے جنگ کے راستے کی طرف بڑھ رہا تھا، اور اس منصوبے کو عمل میں لا کر اس معاہدے کو توڑ رہا تھا، جو اس کے مرحوم باپ نے کیا تھا، جس کی رو سے ترک باسفورس کے یورپی ساحل پر کسی طرح کی قلعہ بندی نہیں کر سکتے تھے۔

جو کچھ ہو رہا تھا، شہنشاہ اس سے غافل نہ تھا وہ سلطان کے اس اقدام کے مضمرات بہت اچھی طرح سمجھ رہا تھا، وہ جانتا تھا عہد شکنی کے بعد بھی ومدار ستارہ اپنا رخ نہیں بدل سکتا، تباہی آ کر رہے گی، اس کی کوئی دھمکی سلطان کو متاثر نہیں کر سکتی، سلطان محمد ثانی کا منصوبہ یہ تھا کہ قسطنطنیہ کو ہر طرف سے گھیر لیا جائے، اور وہاں کے باشندوں کو بھوکا مار دیا جائے۔ یہ فاتحانہ یلغار کا پہلا مرحلہ تھا، اس کے بعد ہر قدم اور زیادہ سخت پڑنے والا تھا۔

لیکن یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی شہنشاہیت کے زعم اور قومی مسئولیت کے احساس فراواں کے باعث وہ احتجاج کرنے پر مجبور تھا۔

اسے خوش آئند جواب ملنے کی ہرگز توقع نہیں تھی اور جب ایک ہفتہ کے بعد اس کے سفراء اورنہ سے واپس آئے، اس کے بدترین اندیشے ہو گیے تھے۔

سلطان محمد ثانی نے اپنے شانے جھٹکتے ہوئے معاہدہ شکنی کا الزام قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس نے کہا میں تو امن پسند آدمی واقع ہوا ہوں، اور میرے اس اقدام کا مقصد دفاع اور تحفظ کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ اس سے جنگ کا خطرہ کیوں پیدا ہو رہا ہے؟ پھر اس کی آنکھوں میں یک بیک چمک پیدا ہو گئی اس نے سفیروں سے مخاطب ہو کر کہا۔ اگر تمہارا شہنشاہ میرے اس اقدام کے پیچھے جنگ و آشوب کے سایے دیکھ رہا ہے، تو یہ دوسری بات ہے۔ میں ہر طرح سے تیار ہوں ——— اور اگر تم اب دوبارہ کوئی پیام لے کر آئے تو تمہاری کھال اتروا لوں گا، ——— یہ جواب ملا، یونان کے اشراف اور شہنشاہ کے سفراء کو۔!

رومیلی حصار کا قلعہ بالائے باسفورس صرف چھ میل کے فاصلے پر مارچ میں بننا شروع ہوا، اور اگست میں یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا، یعنی صرف پانچ مہینے کی مدت میں، یہ بہت بڑا اور عظیم مرحلہ تھا، جو براہ راست سلطان

کی نگرانی میں مکمل ہوا، وہ اپنی حوصلہ مندی کی راہ میں کسی روک کو برداشت نہیں کرسکتا تھا، جیسا کہ خلیل پاشا نے شہنشاہ کو بتایا تھا، ایشیائے کوچک سے ایک ہزار معمار لائے گیے تھے، اور ہر معمار کی ماتحتی میں چار کاریگر اور کئی مزدور دیئے گیے تھے، ہر روز جتنا کام لینا منظور ہوتا تھا، اتنا دیا جاتا تھا اور جو معمار کاریگر یا مزدور اپنا کام روز کا روز مکمل نہیں کرپاتا تھا، اسے عبرتناک سزا ملتی تھی، سلطان محمد ثانی بنفس نفیس کام کی نگرانی کررہا تھا، ہر رات کو محاسبہ ہوتا، اگر کام پروگرام سے زیادہ ہوجاتا تو انعام ملتا، کم ہوتا تو کوڑے پڑتے۔

قلعہ مثلث شکل کا تھا، اس کی دیواریں پتھر کی تھیں جو بائیس ۲۲ فٹ چوڑی تھیں۔ اور جو مینار ہر سہ زاویوں پر بنائے گیے تھے، ان کا قطر تیس فٹ تھا، اس قلعے کی تعمیر کو پانچ سو سال گذر چکے ہیں، ہنوز سر ٹکراتی موجوں کے مقابلہ میں کھڑا ہے اور شاید ابھی کم از کم مزید پانچ سو سال تک اسی طرح کھڑا رہے گا۔

قلعہ کی تکمیل اور سر انجام کار کے سلسلے میں سلطان محمد ثانی نے اپنے آدمیوں کو قریب کے ایک دیہاتی کلیسا کی طرف بھیجا کہ وہاں سے سنگ مرمر کے ٹکڑے محراب، کلیسا، اور ستون وغیرہ اکھاڑ لائیں۔ یونانی جب اس طرز عمل کو برداشت نہ کرسکنے کے باعث مقابلے پر آئے تو وہیں ڈھیر کردئے گیے، سلطان کے سپاہی جب اپنے گھوڑوں اور خچروں کے لئے چارے کی ضرورت محسوس کرتے تو وہ کسانوں کے کھیتوں اور شہریوں کے باغوں کو بلا روک ٹوک استعمال کرتے، جب

ان لوگوں نے دیکھا کہ اس طرح تو کھیت اور باغات ویران ہوتے جا رہے ہیں، اور پکی ہوئی فصلیں تاراج ہو رہی ہیں، تو لڑنے کے لئے سامنے آگئے۔ ایک خون ریز جنگ ہوئی۔ دونوں طرف کے لوگ بڑی تعداد میں ہلاک ہوئے۔ سلطان نے سارے علاقے کو ویران کر دیا۔

شہنشاہ قسطنطین اپنے آدمیوں کی یہ مظلومیت اور بے بسی دیکھ دیکھ کر کڑھ رہا تھا۔ جو شخص زیادہ شفیق اور مرد معقول ہو، اسے کمزور سمجھا جاتا ہے۔ قسطنطین بھی مرد معقول و شفیق تھا، لیکن کمزور طبع نہ تھا، وہ اپنے مقصد میں باعزم اور اسے بروئے کار لانے میں دلیر تھا، اب دامن صبر اس کے ہاتھ سے چھوٹتا جا رہا تھا

"وقت آگیا ہے کہ اس قلعے کو مسمار کرنے اور بے دینوں کو سزا دینے کے لئے ہم اپنی فوج کو اقدام و ہجوم کا حکم دیں"! شہنشاہ نے نمائندگان فوج کے سامنے اعلان کیا۔ اس کی آواز میں قوت تھی، عزم تھا، اور شان حق پرستی!

لیکن اسقف جینا ڈیس[1] نے چرچ کی طرف سے تقریر کرتے ہوئے التجا کی کہ ترکوں سے جنگ نہ چھیڑی جائے۔ نمائندگان شہر نے درخواست کی کہ ترک جیسے دشمنوں کو دعوت جنگ دینا قرین مصلحت نہیں۔ صبر و تحمل سے اس مرتبہ

---

[1] GENNDIUS

پھر کام لیا جائے، نہایت ناگواری اور تلخی کے ساتھ شہنشاہ کو مشورے قبول کر لینا پڑے۔

لیکن جب قلعہ بالکل مکمل ہو گیا، تو اس نے سلطان محمد کو آخری پیغام بھیجا "چونکہ نہ سوگند، نہ عجز، نہ فرماں برداری، کوئی چیز بھی حقیقی اور پائدار امن کی ضامن نہیں بن سکتی۔ لہٰذا جنگ کا حوصلہ نکال لیجئے، مجھے خدا پر بھروسہ ہے اگر اس کی مشیت نے آپ کا دل نرم کر دیا، تو مجھ سے بڑھ کر خوشی کسی کو نہ ہوگی۔ اور اگر اس کا ارادہ یہی ہے کہ شہر آپ کے ہاتھ میں آجائے تو بھی میری کیا مجال ہے کہ اس کے مقدس ارادے میں دخل انداز ہونے کی کوشش کروں، لیکن جب تک خدا ہمارا فیصلہ نہیں کر دیتا، میرا فرض ہے کہ اپنی قوم کا دفاع کرتا ہوا زندہ رہوں، اور دفاع کرتا ہوا جان دوں۔"

اس نے حکم دیا شہر کے دروازے بند کر دیے جائیں۔ آج کے بعد سے کوئی ترک قسطنطنیہ کے اندر داخل نہ ہونے دیا جائے گا۔

اس بات کی آڑ لے کر سلطان محمد ثانی نے اعلان جنگ کر دیا۔

ناقوس بجنے لگے، اب ایک دوسرے کو بے وقوف بنانے کا وقت نہیں رہا تھا، اب خوشنودی حاصل کرنے کا وقت گزر چکا تھا۔

سرد جنگ کا زمانہ مدت ہوئی ہو چکا تھا، اب حقیقی جنگ سامنے تھی، گو ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔

پورا موسم سرما اس طرح گزرا کہ شہنشاہ اور سلطان حقیقی جنگ کی تیاریوں میں شدت کے ساتھ مصروف اور منہمک رہے۔

شہنشاہ کی کمان میں وہ شہر تھا، جو خستہ اور درماندہ تھا، دیرینہ سال تھا، جس کے باشندے کئی صدیوں سے امن و سلامتی کی زندگی بسر کرنے کے خوگر تھے۔ کسی جنگ میں شریک نہ ہوئے تھے، یہ مردمان سبک سر اور تنعم پسند، جنگ جو نہ تھے، آرام پسند تھے، ان کی ساری سرگرمی کار، چوتھی صلیبی جنگ میں تاراج اور برباد ہو گئی تھی، ان میں پہل کرنے کا حوصلہ ماند پڑ چکا تھا، یہ وہ لوگ تھے جو بزدل اور کم حوصلہ بن چکے تھے اب یہ صنعت و حرفت کے دلدادہ تھے، یہ بڑے بڑے ٹیکس ادا کرتے تھے، اور اپنے بچوں کو رسمی طور پر فوجی تربیت کے لئے بھی بھیج دیا کرتے تھے، مزدور اور کاریگر مشقت کا کام کر چکنے کے بعد شراب تلخ سے جی بہلانے کے عادی تھے، نہ جانے کتنی نسلیں گزر گئی تھیں کہ یہ ایک شہنشاہ کے زیر سایہ زندگی بسر کر رہے تھے، معاملات حکومت میں انہیں کوئی دخل نہ تھا، نہ انہوں نے سیاست میں حصہ لیا تھا نہ جنگ میں کسی مرد جنگی یا مفکر کا ان میں پیدا ہونا یا ابھرنا ایک آرزوئے محال تھی۔

فوج کے سپاہی اور افسر زیادہ تر متصلہ صوبوں اور شہروں سے بھرتی ہو کر آیا کرتے تھے۔ لیکن اب کہ ایشیائے کوچک پر ترکوں کا قبضہ ہو چکا تھا،

شہنشاہ کا ان شہروں سے رشتہ منقطع ہو چکا تھا، جہاں سے مردانِ جنگی کی کھیپ آیا کرتی تھی،

فوج کے افسر اور تربیت کنندہ زیادہ تر اشراف شہر تھے، انہیں خود بہت معمولی فوجی تربیت ملی تھی، اور اس پر یہ قانع بھی تھے اور خوش بھی، ان کا جذبہ کارِ مدت ہوئی سرد ہو چکا تھا، جہاں تک جرأت اور دلیری کا تعلق تھا اس کی کمی نہ تھی، لیکن اس کے استعمال کرنے کا فن نہیں جانتے تھے، اور جنگ میں اس کی ضرورت ہوتی ہے، یہ گلے کی منصوبہ بندی نہیں کر سکتے تھے نہ باہر سے مدد حاصل کر سکنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

قسطنطنیہ کے تمام شہریوں کے مابین خواہ وہ اشراف و اعیان کا طبقہ ہو یا عوام کا گروہ، سب سے بڑا رابطہ مذہب کا تھا اور اسی چیز نے جنگ جوئی کا جذبہ کمزور کر دیا۔ پادری اور اسقف اور راہب بھی دوسرے لوگوں کی طرح آرام پسند تھے، جنگ سے ناآشنا ایک مدت دراز سے سکون و سلامتی کی زندگی بسر کرنے کے خوگر تھے ایک عرصۂ دراز سے یہ بیکار تھے، اور ہر طرح سے محفوظ بھی، اور بے غل و غش حکومت کرتے رہنے کے عادی بھی اب پوزیشن یہ تھی کہ اشراف و اعیان شہر جنگ اور مقاومت کو بے نتیجہ سمجھتے تھے اور اہل کلیسا کسی معجزے کے متوقع تھے۔

جنگ کا سارا بار صرف قسطنطین کے دوش ناتواں پر آپڑا تھا، اس چھ

مہینے میں ہر ساعت اور ہر لمحہ اس نے صرف ایک ہی کام میں صرف کیا، سوتوں کو جگایا، مدہوشوں کو جھنجھوڑا، اور میدان جنگ کی طرف دعوت دیتا رہا، عملاً صورت حال یہ تھی کہ وہی فرماں روا بھی تھا اور کمانڈر انچیف بھی، جنگ کے منصوبے بھی وہی تیار کرتا، امن کے نقشے بھی وہی بناتا، اور ایثار و قربانی، خلوص اور حبِ وطن کا نمونہ بھی اپنی قوم کے سامنے پیش کرتا۔

بدقسمتی سے قسطنطین کا پہلا عوامی عمل فراہمیٔ سپاہ اور تکمیلِ مقاصد کے سلسلے میں عوام کی ناراضی اور ناگواری کا سبب بن گیا۔

۱۲ دسمبر کو یعنی رومیلی حصار کی فصیل تیار ہونے کے چھ ماہ بعد شہنشاہ نے ایک مذہبی مجلس اپنی سربراہی میں منعقد کر کے کچھ مذہبی مراسم انجام دیئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قوم کے بہت سے لوگ بادشاہ کی تائید اور امداد و اعانت سے دست کش ہو گئے۔ شہنشاہ نے رومن کیتھولک کارڈینل اسیڈور[1] کو مدعو کیا کہ وہ کلیسائے سانتا صوفیہ میں شام کی دعا کرائیں، موصوف نے یہ مراسم رومن کیتھولک طریقے پر، نہ کہ یونانی کیتھولک طریقے پر انجام دیئے، شہنشاہ نے اس موقع پر کارڈینل کے ہاتھ سے نان و شراب مقدس کا تبرک بھی قبول کیا۔

کوئی شبہ نہیں شہنشاہ یونانی آرتھوڈکس کلیسا کا کٹر پیرو تھا، بالکل اس طرح

---

[1] ISIDORE

جیسے قسطنطنیہ کے تمام لوگ تھے لیکن رومی کارڈینل کے ہاتھ سے نان و شرابِ مقدس کا لے لینا رعایا کے نزدیک یونانی کلیسا کی سخت ترین اور ناقابلِ برداشت توہین تھی، وہ خود بھی اپنی اس حرکت پر نادم تھا، اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے یسوع مسیح کی تصویر اسے خشم آلود نظروں سے دیکھ رہی ہے، لیکن ایک بڑے مقصد کے لئے یعنی ملک کی سلامتی کے لئے اس نے اپنے ذاتی جذبات اور عقائد تک کی قربانی گوارا کر لی تھی۔

لیکن اس ایثار سے اسے حاصل کیا ہوا ——— ؟

اس کی یہ حرکت درحقیقت مصلحت پر مبنی تھی چھ مہینے پہلے جب خلیل پاشا نے پہلے پہل اسے متنبہ کیا تھا، قسطنطین نے نقشۂ جنگ تیار کرنا شروع کر دیا تھا، چونکہ اس کی فوجی قوت بہت کم تھی، اس نے محسوس کیا، جب تک باہر سے مدد نہ ملے کام نہیں چل سکتا، اور یہ مدد حاصل کرنے کے لئے اس نے مغرب سے اپیل کی، جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ رومن کیتھولک دنیا سے مدد کا طالب ہوا۔ اگر بے دینوں کو شکست دینا ہے تو ضروری ہے کہ دونوں بڑے کیتھولک کلیساؤں (رومن و یونانی) میں صلح ہو جائے، یہی سوچ کر قسطنطین نے اپنے دو سفیر پوپ کے دربار میں بہ مقام ویٹیکن[1] بھیجے

---

[1] VATICAN

گزشتہ چار سو سال سے یکے بعد دیگرے ہر پوپ دونوں کلیساؤں کے مابین اتحاد اور یک جہتی کی کوشش کرتا چلا آ رہا تھا اور اب پہلی مرتبہ خود یونانی شہنشاہ نے اس اتحاد کی پیش کش کی تھی، شرط یہ رکھی تھی کہ اس اقدام کے صلے میں اسے لڑنے والی افواج دی جائے، تاکہ ترکوں کو شکست دی جا سکے۔

دربار پوپ کے لوگوں نے شہنشاہ کے سفیروں کو سرد مہری کی نظر سے دیکھا وہ دیرینہ بے اعتمادی جو یونانیوں کے خلاف پیدا ہو گئی تھی، اب تک موجود تھی لیکن انہوں نے سوچا ایک نمائندہ قسطنطنیہ بھیج دینے میں مضائقہ بھی کیا ہے؟ یہ سبب تھا کہ کارڈینل ازیڈور چھ مہینے کے بعد پچاس نفر ساتھ لے کر جن میں اسقف بھی تھے، اور سپاہی بھی، قسطنطنیہ پہنچا، اس کی آمد کی خبر پہلے ہی افشاء ہو چکی تھی۔ اور قسطنطنیہ کی سرزمین پر اس کے وارد ہونے سے پہلے ہی عوام بھڑک چکے تھے۔

چنانچہ دسمبر میں جب رومی کارڈینل نے سانتا صوفیا کے کلیسا میں عشائے ربانی کے مراسم ادا کئے اور شہنشاہ نے اس کے ہاتھ سے نان و شراب مقدس کا تبرک قبول کیا تو یونانی چیخ اٹھے کہ ہمارے ساتھ دھوکا کیا گیا ہے، اور جب پوپ کا نام دعائے عشائے ربانی میں لیا گیا تو برہمی اور بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے مخالفانہ نعرے لگائے۔

ان نامبارک مراسم کلیسائی کی ادائیگی کے بعد بوہمی اور اشتعال کے عالم میں لوگ گلیوں، کوچوں اور سڑکوں پر گشت کرنے لگے، انہوں نے یورپینوں کے خلاف

اظہار ناراضی کیا، انہوں نے دونوں کلیساؤں کے اتحاد پر حد درجہ برہمی کا علی الاعلان اظہار کیا، اور پوشیدہ طور پر اپنے شہنشاہ کے خلاف بھی زہر اگلا۔ گرینڈ ڈیوک نوٹارس نے جس کا مرتبہ شہنشاہ کے بعد تھا، عوام کی ہمت افزائی کی، اور پیٹھ ٹھونکی۔ گرینڈ ڈیوک نوٹارس، اور دوسرے اشراف اعیانِ شہر دونوں کلیساؤں کے اتحاد کے خلاف تھے۔ گرینڈ ڈیوک نے کہا، "محمڈانی کی دستار کارڈینل کی کلاہ سرخ کے مقابلے میں کہیں بہتر ہے"! بہت جلد یہ نعرہ زبان زد خاص و عام ہو گیا۔

کلیسائے سانتا صوفیا اب ویران ہو چکا تھا، جو لوگ کلیسا میں جانے کے خوگر تھے، وہ اب میکدوں میں وقت بسر کرنے لگے۔ بجائے دعا اور مناجات کے توہم پرست، ضعیف الاعتقاد، راہبوں کے مواعظ سننے میں وقت صرف کرنے لگے۔

اور یہ کلیسا کے مقدس لوگ اپنے وعظ میں کہتے کیا تھے؟ "خدا فرشتوں کے ذریعے دشمن سے ہماری حفاظت کرے گا"! ہو سکتا ہے کافروں (مسلمانوں) کی فوجیں شہر میں داخل ہو جائیں، لیکن جب وہ داخل ہو جائیں گی تو آسمان سے ایک نیلے رنگ کا فرشتہ اترے گا، اور دشمن کو غارت کر کے رکھ دے گا"!

لوگ ان مواعظ سے مطمئن ہو جاتے، اور فرشتے کا اور دشمن کا انتظار کرنے لگتے۔

خطرناک ترین دشمن سر پر کھڑا تھا، لیکن مذہب نے قسطنطنیہ کے لوگوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا تھا۔

یہ سارا فتنہ ان پچاس آدمیوں کی وجہ سے اٹھا جو یورپ سے آئے تھے۔

شہنشاہ کو سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت اور کمی محسوس ہو رہی تھی وہ مردانِ جنگی کی جمعیت تھی،

قسطنطین ذاتی نیکی اور نرم خوئی کے باوجود بہت بڑا اور بہت اچھا مدبر، اور منتظم تھا۔ اس نے ہر اس در پہ دستک دی جہاں سے ذرا بھی مدد مل سکتی تھی، اس کے لئے یہ جاننا ناگزیر تھا کہ کون لڑے گا، اور کون جی چرائے گا؟ کتنے آدمی ہیں جو سرفروشی کے لئے آمادہ رہیں گے؟ ہر گھر کی پڑتال کی گئی، ہر آدمی سے پرسش ہوئی کہ اپنے شہر، قومی حفاظت اور دفاع کے لئے ہتھیار اٹھانے کو وہ کہاں تک تیار ہے؟

شہنشاہ نے نتائج تفتیش اپنے معتمد فرانزا کے سامنے پیش کر دیے جملہ اعداد و شمار فرانزا کے پاس تھے، اور یہ اعداد و شمار کچھ زیادہ دل خوش کن اور امید افزا نہ تھے، ایک لاکھ کی آبادی میں صرف ۴۹۷۰ آدمیوں نے لڑنے پر آمادگی کا اظہار کیا، حالانکہ شہر میں کم از کم ۳۵ ہزار نفوس رہتے تھے، جو جنگی صلاحیت رکھتے تھے، اور شہنشاہ کی طرف سے ان کی خبر گیری اور امداد کا سلسلہ برابر جاری تھا لیکن یہ قدم آگے بڑھانے کو تیار نہ تھے، ان میں کچھ بزدل تھے، اور باقی اس لئے

خفا تھے کہ شہنشاہ نے رومن کیتھولک کارڈینل کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا تھا، وہ کلیسائے یونان کی توہین کے مترادف تھا،

اشراف و اعیانِ شہر کی بڑی جماعت شہر سے رخصت ہو گئی تھی، کیوں کہ محاصرے کی دہشت نے ان لوگوں کا حال زار و زبوں کر دیا تھا، جو تھوڑے سے باقی تھے، وہ انتہائی وفادار اور آخر وقت تک لڑنے کو تیار تھے، لیکن ایک بڑا طبقہ ایسا بھی تھا جو گرینڈ ڈیوک کی طرح اظہارِ وفاداری سے گریز کر رہا تھا، یہ لوگ موقع جنگ پر موجود رہنا چاہتے تھے، تاکہ جس کا پلہ بھاری ہو اس کا ساتھ دیں، انہوں نے اپنی بیویوں کی تحویل میں سارا زر و مال دے دیا تھا، شہر کے عوام بھوکے مر رہے تھے اور انہیں ذرا پرواہ نہ تھی، فرانزا نے اعداد و شمار کی روشنی میں اندازہ کیا تھا کہ اگر یہ مخفی دولت سامنے آجائے تو نہایت آسانی سے کرایہ کی فوج ترکوں سے لڑنے کو مہیا کی جا سکتی ہے، اور شہر کا دفاع بھی اچھی طرح کیا جا سکتا ہے، اس زمانے میں کوئی یورپین ملک مستقل فوج نہیں رکھتا تھا جب جنگ ناگزیر ہو جاتی تو کرایے کے سپاہی فراہم کیے جاتے، اور لڑائی شروع ہو جاتی، یہ پیشہ ور سپاہی بڑی آسانی سے دستیاب ہو جاتے۔ ان میں ہر مذہب و ملت کے لوگ ہوتے تھے، ان لوگوں کی اجرت ان سپاہیوں سے زیادہ ہوتی تھی جو کسی مقصد کے لیے لڑتے تھے۔

شہنشاہ نے جب فرانزا کی رپورٹ سنی تو اس کا چہرہ تمتما اٹھا، اتنے بڑے

عظیم اور شاندار شہر میں صرف یہ مٹھی بھر آدمی تھے، جو اپنے وطن اور بال بچوں کے لیے جان کی بازی لگانے کو تیار تھے!

فرانزا نے شہنشاہ کے سامنے رپورٹ پیش کرتے ہوئے سرگوشی کے لہجے میں کہا، "یہ ایک راز ہے جو ہمارے درمیان محفوظ رہنا چاہیئے"۔ اور یہ راز چار سال تک راز رہا، حتیٰ کہ فرانزا نے خود اپنی کہانی لکھی، اس راز کا انکشاف کرتے ہوئے اس نے بتایا کہ کس طرح شہنشاہ نے ترکوں سے شہر کو بچانے کے لئے تمام جتن کر ڈالے۔

غلطہ میں جو جنوی مقیم تھے، انہوں نے چار ہزار مردانِ جنگی کی شہنشاہ کو پیش کش کی، جس سے ان کا مقصد یونانیوں کی امداد نہ تھا بلکہ وہ وینس والوں پر بازی لے جانا چاہتے تھے۔ یہ کرائے کے لوگ تھے اور مال و زر کے لالچ میں انہوں نے اپنی خدمات پیش کی تھیں۔

قسطنطنیہ کے دفاع کے سلسلے میں سب سے بڑی گراں مایہ اور قابلِ قدر پونجی جان جسٹینیانی[1] کی ذات تھی، یہ ایک جنوی ناخدا تھا، جو جنوا سے ۱۴۵۳ء[2] میں اپنے جہاز پر سوار ہو کر آیا تھا۔

---

[1] JOHN GIUSTINIANI

[2] ۱۴۵۷ء

جان جسٹینیانی قد و قامت کے لحاظ سے بلند و بالا، شکل و صورت کے اعتبار سے مرد معقول، قوت و طاقت کی حیثیت سے یگانہ اور یکتا تھا، وہ ایک نجیب و شریف خاندان کا فرد تھا، وہ خود اپنے جذبۂ اخلاص سے مجبور ہو کر شہنشاہ کی مدد کو پہنچا تھا، اپنے ساتھ وہ اپنے خاص الخاص ۷۰۰ مردانِ جنگی کو بھی لایا تھا، ان میں سے چار سو زرہ پوش سپاہی تھے، جو میدانِ جنگ کا بہت اچھا تجربہ رکھتے تھے۔

اگر عالم بالا سے فرشتے بھی کرۂ ارض پر شہنشاہ کی مدد کے لئے اتر آتے تو اسے اتنی خوشی نہ ہوتی، جتنی جسٹینیانی اور اس کے سات سو آدمیوں کے آنے سے ہوئی۔ شہنشاہ نے فوراً جسٹینیانی کو اپنی فوج کا سپہ سالار اعلیٰ (کمانڈر انچیف) بنا دیا، اور اعلان کیا کہ کامیابی کے ساتھ جنگ ختم ہو لے تو وہ تحفے کے طور پر جسٹینیانی کو جزیرہ لسبوس[1] بخش دے گا، پھر اس نے سنجیدگی کے ساتھ فرانزا سے کہا، "یہ بڑا اچھا آدمی ہے۔ اس کے ساتھ کام کر کے تجھے خوشی ہوگی۔" فرانزا نے چبھتے ہوئے لہجے میں جس سے بدگمانی عیاں تھی، کہا، "لڑائی تو اس کا پیشہ ہے یہ جنگ میں شرکت اپنے مخصوص مقاصد کے لئے کر رہا ہے۔" شہنشاہ نے پھر اپنے پچھلے قول کا اعادہ کیا، اور کہا "نہیں ایسا نہ کہو، وہ

---

[1] LISBOS

قابل اعتماد ہے، اور میری ساری امیدیں اب اس کی ذات سے وابستہ ہو کر رہ گئی ہیں۔"

غلطہ کے جنوی سپاہیوں اور بیزنطینی کے درآمد کردہ سپاہیوں کے علاوہ تقریباً ۱۶۰ نفوس جو وینس والوں اور دوسرے یورپین ممالک کے باشندوں پر مشتمل تھے، ایسے تھے جو سکونت سے قسطنطنیہ میں رہتے چلے آرہے تھے، یہ لڑائی جس طرح یونانیوں کی تھی، اسی طرح ان لوگوں کی بھی تھی اور جب امتحان کی گھڑی آئی بہت سوں نے قابل قدر کارنامے انجام دیئے

شہنشاہ کا دوسرا اقدام یہ تھا کہ اس نے غیر معمولی قابلیت رکھنے والے دو غیر ملکیوں کو جو عرصے سے قسطنطنیہ میں رہ رہے تھے، اور بہت زیادہ مشہور و معروف تھے، اپنے حضور میں طلب کیا، ان میں سے ایک جان گرانٹ[1] جو انتہائی زیرک اور ہوشیار شخص تھا، فوراً شہنشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی خدمات پیش کر دیں، یہ جرمنی کا رہنے والا تھا اور فن معدن کاری میں نمایاں دسترس رکھتا تھا، لیکن اربن نے جو ہنگری کا باشندہ اور ماہر فن توپچی تھا، غداری کی اور ترکوں سے جا ملا،

گرانٹ نے شہنشاہ سے کہا، "آپ نے اسے کم دیا،" گرانٹ چونکہ

---

[1] JOHANN GRANT

عرصے سے قسطنطنیہ میں رہ رہا تھا۔ لہٰذا آسانی سے یونانی زبان میں بات چیت کر لیتا تھا۔ اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا، "اربن ایک موٹا تازہ آدمی ہے۔ خوش خور اور شکم پرست ہے۔ وہ کافروں (مسلمانوں) کے پاس چلا گیا ہے۔ جن کے پاس سونا بھی ہے، اور کوئلہ بھی۔ وہ ان دونوں چیزوں میں سے جو چاہے حاصل کر سکتا ہے۔!"

"نہیں وہ سونا لے گا، اسے سونا ملے گا!" شہنشاہ نے دل گیر اور افسردہ لہجے میں کہا "مدت ہوئی ابرہم نے ایک دیو ہیکل توپ بنانے کے بارے میں بات چیت کی تھی، لیکن قسطنطنیہ کا خزانہ خالی تھا، وسائل محدود تھے، وہ اس کا یہ پروگرام نہ قبول کر سکا!"

موسم بہت سرد تھا، اور راتیں تو انتہائی ٹھنڈی تھیں لیکن شہنشاہ نے قصر بلاچرنی میں انگیٹھی سلگانے کی سخت ممانعت کر رکھی تھی، آج کل کی طرح قسطنطنیہ میں کمروں کو فرش کے ذریعہ گرم رکھتے تھے، لیکن جو لکڑی فرش کے نیچے کمروں کو گرم رکھنے کے لئے جلائی جاتی تھی، وہ مطبخ میں منتقل کر دی گئی تھی تاکہ سپاہیوں کے لئے روٹیاں پکانے کے کام آئے، ہر ممکن ذریعہ سے غذا اور اناج فراہم کرنے کی جد وجہد کی جا رہی تھی اور اس موسم سرما میں اسے ذخیرہ کیا جا رہا تھا۔ کہ موسم بہار میں جب جنگ شروع ہو گی، تو اس سے کام لیا جائے۔ جو مٹھی بھر جنگجو جنگ کے لئے تیار تھے، ان کے لئے اپنے سلاح خانے سے شہنشاہ نے تیر و کمان

اور تفنگ و سپر بھیجے،

بندرگاہ پر ایک نہایت مضبوط زنجیر تیار کی گئی جو بڑے بڑے بہتے ہوئے شہتیروں پر استوار کی گئی، کہتے ہیں کہ اس کا ایک ایک آہنی حلقہ اتنا بڑا تھا جتنا جسٹینیانی جیسے بلند و بالا شخص کا پاؤں، وقت آنے پر یہ زنجیر شاخ زریں کے دہانے میں ڈال دی گئی، ہر وہ کشتی جو بندرگاہ میں داخل ہوتی تھی، پابند تھی کہ قومی خدمت کے کام میں حصہ لے، ہمیں ہر سواری کی کشتی اور ہر مال بردار کشتی کی ضرورت ہے، شہنشاہ نے اعلان کیا۔

اس طرح چھ مہینے گزر گئے، لیکن اسی طرح کہ چین کی نیند حرام تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ گھبرا اٹھے، خود فرانزا کا یہ حال تھا کہ حد درجہ ملول و پریشان رہا کرتا۔ گرینڈ ڈیوک اونوٹارس بالکل الگ تھلگ تھا، ہر روز اور ہر دفعہ ——— دن میں کئی کئی بار شہنشاہ، جان گرائٹ اور جسٹینیانی سے فوجی دفاع پر گفتگو کیا کرتا،

قسطنطنیہ کی قوت مدافعت کا ایک اور بہت بڑا منبع تھا، جس سے دفاع میں غیر معمولی مدد مل سکتی تھی، یہ قسطنطنیہ کی فصیل تھی، جو پانچویں صدی عیسوی میں تعمیر ہوئی تھی، اور بعد کی صدیوں میں برابر اس کی مرمت، درستی اور تعمیر کا سلسلہ جاری رہا، اب یہ فصیل بازنطینی سلطنت کا نشان حد بندی تھی ——— اور اس بظاہر ناقابل تسخیر حد بندی کا طول چودہ میل تھا، دیوار تین تہ

موٹی تھی، یہاں استحکامات بھی تھے، اور قلعہ بندیاں بھی اور یورپ کی فصیلوں کے مقابلے میں کہیں بہتر اور مضبوط

یہ دیواریں تین طرف پھیلی ہوئی تھیں، مغرب کی طرف جو خشکی کا حصہ تھا، بحر مارمورا کی طرف اور شاخ زریں کی جانب خشکی کی طرف کا سلسلہ قصر بلاچرنی سے بحیرۂ مارمورا کی طرف تقریباً چھ میل تک چلا گیا تھا، یہ چھ میل کا رقبہ تھا، اندرونی دیواریں جو سد سکندری سمجھی جاتی تھیں، ۴۰ سے ۷۰ فٹ تک بلند اور ۱۲ سے ۳۶ فٹ تک چوڑی تھیں، ٹھوس پتھر سے بنی ہوئی، ان پر کئی منزلہ برج بنے تھے۔ بیرونی دیوار کم بلند تھی۔ دونوں کے درمیان ۵۰ فٹ کا ایک چبوترہ تھا، جہاں سپاہی ایک دوسرا دفاعی مورچہ بیرونی دیوار میں رخنہ ہو جانے کی صورت میں قائم کر سکتے تھے، یہی وہ مقام تھا جہاں آخری طور پر دست بدست جنگ لڑی جا سکتی تھی۔!

بیرونی دیوار سے آگے ایک ۶۰، ۷۰ فٹ چوڑی خندق تھی جو کسی جگہ بھی ۳۰ فٹ سے کم گہری نہیں تھی، محاصرے کی صورت میں اس کے پل بڑی آسانی سے اٹھا لیے جا سکتے تھے، خندق کی دیواریں ایسے پتھروں سے بنائی گئی تھیں جو حد درجہ ہموار اور چکنے تھے، جن پر کسی طرح پاؤں ٹک ہی نہیں سکتا تھا، خندق میں پانی کی نالیاں پوشیدہ تھیں، جن سے ضرورت کے وقت سیلابی کیفیت پیدا کر کے دشمن کے بڑھتے ہوئے قدم روکے جا سکتے تھے، نیز

حسب موقع، محصورین کو پانی بھی پہنچایا جا سکتا تھا، یہ پائپ ایک سرکاری راز کی حیثیت رکھتے تھے، جس کا علم شہنشاہ کے علاوہ صرف چند معتمد خاص ہی کو تھا،

خشکی کی طرف جو دیواریں تھیں، ان میں سات بڑے بڑے پھاٹک تھے۔ ان میں سے ہر دروازہ ایک داستان غم انگیز و جاں سوز کا حامل ثابت ہوا جس کا ذکر آگے آئے گا۔

بحیرہ مارمورا کی جانب کی دیواریں خشکی کی طرف والی دیواروں سے نیچی تھیں کیوں کہ سمندر بجائے خود ایک قدرتی قلعہ تھا، اور شاخ زریں کی جانب یہ دیواریں اور زیادہ نیچی تھیں، کیوں کہ یہاں زنجیر یا سدِ عظیم، ساحل کی حفاظت کے لئے موجود تھی، یہاں کسی مضبوط دیوار کی ضرورت نہ سمجھی گئی۔

یہ تھیں قسطنطنیہ کی فصیل کی دیواریں۔

ذرا غور کیجئے، توپ کی ایجاد سے پہلے، ان کا سر کر لینا کتنا محال اور ناممکن کام تھا، سب سے پہلی رکاوٹ خندق کی تھی، جس کا عبور کرنا ناممکن ہی نہ تھا، کیوں کہ یہ بجائے خود ایک گہری اور چوڑی ندی تھی، جس کی بلند دیواریں چکنی چٹانوں سے بنی تھیں، جن پہ پاؤں جمانا ممکن نہ تھا۔

لیکن اگر کسی طرح خندق پار کر لی جائے تو سلسلۂ کوہ کی طرح کئی مضبوط اور مستحکم سنگی دیواریں راستہ روکے کھڑی تھیں، حملہ آور یہاں سے بھی گزر جائیں تو

آگے بیرونی دیوار سدِ سکندری کی طرح حائل تھی۔

اور اگر یہ ناممکن بھی ممکن ہو جائے یعنی خندق بھی پار کر لی جائے اور دیواروں کے مورچے بھی ٹوٹ جائیں تو دشمن کو ان فوجوں سے سامنا کرنا پڑے گا جو کیل کانٹے سے لیس سینہ تانے، مرنے مارنے کو تیار کھڑی دشمن کا انتظار کر رہی تھیں

اور سب سے آخر میں حملہ آور کو اس اندرونی دیوار سے عہدہ برآ ہونا تھا جو ایسا محفوظ ترین دفاعی مورچہ تھا، جو آج تک کوئی انسان تعمیر نہیں کر سکا تھا گزشتہ ایک ہزار سال سے یہ دیوار دشمنوں کی افواجِ گراں کو پسپا کرتی چلی آ رہی تھی؛ لیکن سلطان محمد ثانی کو اپنی فتح کا کامل یقین تھا۔!

ترکوں کی جنگی تیاریاں

اپریل ۱۴۵۳ء [1]

قسطنطین اعظم کے قصر بلاچرنی سے ڈیڑھ میل دُور سینٹ رومانوس [2] کے پھاٹک کے بالکل مقابل اپنے سرخ اور سنہرے خیمہ کے اندر سلطان محمد ثانی

---

[1] مطابق ربیع الاوّل ۸۵۷ھ

[2] St. ROMANUS

فروکش ہیں۔

ترکی سپاہی سلطان کے سامنے سے سلامی دیتے ہوئے گزر رہے تھے۔ ان میں تیر انداز، سنگ انداز، نیزہ بردار اور شمشیر فگن، سب شامل تھے۔ امرائے قسطنطنیہ شہر پناہ سے آدمیوں کی یہ متحرک لہریں دیکھ رہے تھے، جو غلطہ کی پشت پر واقع پہاڑیوں پر سے گزر کر سلطان کے سامنے آ رہی تھیں۔ یہی جگہ تھی جہاں سے وہ کاروان اور قافلے بھی گزرا کرتے تھے، جو اس عظیم شہر کے لئے غلہ لایا کرتے تھے، اور سواروں کے عقب میں فوج کی رسد کے لئے مویشیوں کے گلے چلے آ رہے تھے۔

دشمن (مسلمانوں) کی تعداد لاکھوں سے متجاوز تھی، سامنے کی صف میں ترک سپاہی سرخ جبے پہنے دھوپ میں چمکتی ہوئی آبدار شمشیریں ہاتھ میں لیے چلے آ رہے تھے، ان کے پیچھے وہ جنگی قیدی تھے جو غلام بنا لیے گئے تھے، ان میں سربیا، بلغاریہ اور ہنگری کے لوگ شامل تھے، جنہیں یونانیوں سے لڑنے پر مجبور کیا جا رہا تھا اور ان کی پشت پر وہ کرائے کے سپاہی تھے جو کافروں (مسلمانوں) کے پہلو بہ پہلو منہ مانگی قیمت لے کر لڑنے آئے تھے۔

اس تعداد میں ہر روز اضافہ ہو رہا تھا۔!

تھوڑے تھوڑے وقفے پر بیل بھاری ترکی توپیں کھینچتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ فوج شہر کی مغربی جانب کی پہاڑیوں پر خیمہ زن تھی، خیموں کی یہ

قطاریں شاخ زریں کے شمالی کنارے سے (جو قصر بلاچرنی سے قریب تھا) بحر مارمرا تک پھیلی ہوئی تھیں۔

دن کے وقت جہاں تک آنکھ کام کرتی تھی، پہاڑیوں پر سپاہی، جنگی قیدی، گھوڑے اور بیلوں کے گلے نظر آتے تھے، رات کے وقت ان خیموں سے نکلنے والے شعلۂ آتش کا عکس بادلوں پہ، کچھ اس طرح پڑتا تھا، کہ یونانی، حیرت، تحسین، اور دہشت کے ملے جلے جذبات سے مسحور ہو کر دیر تک تماشائی بنے کھڑے رہتے تھے۔ عروس البلاد کا رشتہ باہر کی دنیا سے پورے طور پر منقطع ہو چکا تھا، نہ کوئی شخص اندر داخل ہو سکتا تھا، نہ باہر نکل سکتا تھا۔

بالائے باسفورس رومیلی حصار پر جو کشتی خوراک اور اناج لیے ہوئے بحر اسود سے اس طرف آتی تھی، ترک اسے روک لیتے تھے، قلعہ رومیلی حصار پر توپیں نصب تھیں، اگر کوئی جہاز نہ رکے اور آگے بڑھنے پر اصرار کرے تو ان توپوں کے دھانے گولے اگلنے لگتے تھے، وینس والوں کی ایک کشتی نے نافرمانی کی ایک ہی گولے نے اسے تہ آب کر دیا۔ کشتی کے ملاح اور عملے کے لوگ سمندر میں کود پڑے، یہ ڈوبنے سے تو بچ گئے لیکن ترکوں نے انہیں گرفتار کر لیا، اور اپنے سالار کے سامنے پیش کیا، یہ کل تیس آدمی تھے، سب کے سب ہلاک کر دیے گئے، ان کے جسموں کے دو ٹکڑے کر دیے گئے۔

کشتی کے ناخدا کی گردن اڑا دی گئی، اتفاق کی بات ہے یہ وہی ناخدا تھا جس کی کشتی پر بیٹھ کر نو مہینے پہلے فرانزا نے بحر اسود کی طرف سفر کیا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا اس مسافرت کو سو برس گزر گئے ہیں، شہنشاہ جس کی منگیتر کے لیے یہ سفر کیا گیا تھا وہ اپنے ہونے والے شوہر کے انتظار میں گھڑیاں گن رہی تھی حالات نے اسے فراموش کر دیا تھا۔

لیکن یہ سفر کی ترکوں کو مہنگا پڑا، قسطنطنیہ میں اور جزیروں میں جو وینس کے لوگ تھے، اور اب تک جنگ سے الگ تھلگ تھے، اور محض خوش وقتی کے طور پر یہاں مقیم تھے، برہم ہو گئے، اور صمیم قلب کے ساتھ انہوں نے شہنشاہ کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا، اب یہ جنگ وینس والوں کی جنگ بھی بن گئی تھی

یہ دو قومیں جو ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو کر میدان جنگ میں اترنا چاہتی تھیں، بنیادی اور اصولی طور پر باہم دگر اتنی ہی مختلف تھیں، جتنے ان کے سردار اور زعیم متفاوت تھے، سلطان محمد ثانی اپنے سرخ و ھاریدار ریشمی خیمے میں حوصلہ مندی کی زندگی گزار رہا تھا، اور شہنشاہ بلاچرنی میں پیکر حیرت بنا بیٹھا تھا ترکی قوم جوان اور نیرومند تھی، یونانی قوم دیرینہ سال اور درماندہ تھی اور ماضی کے دھندلکے میں زندگی بسر کر رہی تھی ——— حقیقت یہ ہے کہ یونانی قوم پر روحانی موت طاری ہو چکی تھی۔

ترک گلہ بان تھے، جنگ جو تھے، صحرا گرد تھے، اور اب چشم زدن میں فاتح

اور کشور کشا بھی بن گیے تھے ، بہ بنائے عادت خوراک کے معاملے میں صرف جو تھے ان کے لب کسی طرح کے نشے سے آلودہ نہیں ہوئے تھے ،

فوجی اعتبار سے یہ دنیا کے بہترین سپاہی تھے ، انتہائی سختی کے ساتھ ضبط و نظم کی پابندی کی انہیں تربیت دی گئی تھی ، اپنے فرماں روا کی آنکھ بند کر کے اطاعت کرتے تھے ، ان کے ہاں شخصیتِ فرد ، ملت کی اجتماعیت میں گم ہو گئی تھی ، اس تربیت نے انہیں فرماں بردار ، خوش خو ، متحمل اور بہادر بنا دیا تھا ، اور جہاں کہیں دین کا معاملہ آجاتا یہ جان سے گزر جاتے اور پھر ہوش میں نہ رہتے - ان میں کا ہر فرد مرنے مارنے کو تیار ہو جاتا ، جنگ کے آخری مرحلوں پر بھی کلمۂ اسلام ان سے معجزے صادر کرا دیتا ، —!

سلطان محمد ثانی کی فوج میں سواروں کا دستہ سارے لشکر کا جوہر تھا ، یہ لوگ " سپاہی " کہلاتے تھے ، یہ زرہ پوش رہتے ، اور شمشیر کج ان کی کمر سے لٹکی رہتی ، نیزۂ دراز ، اور گرز آہنی ان کے ہاتھ میں ہوتا ، یہ کبھی نہ تھکنے والے سوار تھے ، طلوع آفتاب سے غروب آفتاب کی درمیانی مدت میں یہ آسانی سے ۸۰ سے ۹۰ میل تک کی مسافت طے کر لیتے ، فوج کے ساتھ ساتھ خالی گھوڑے بھی رہتے جب کسی سوار کا گھوڑا تھک جاتا یا ناکارہ ہو جاتا ، فوراً تازہ دم اسپ صبا رفتار کے نکتے گھوڑے کو وہیں چھوڑ دیتا - ایک ترک سپاہی پاپیادہ بہت اچھی طرح لڑ سکتا تھا ، لیکن لازمی تھا کہ اس کا گھوڑا اس کے پاس ہی رہے ،

جب پیادہ فوج کا حملہ کامیاب نہ ہوتا، تو "سپاہی فوراً ان کی جگہ لے لیتے،
ان سپاہیوں کے افسر بھی بڑے پائے کے لوگ مقرر کیے جاتے، یہ لباس
فاخرہ استعمال کرتے، ان کے خیمے بھی شاندار ہوتے، لیکن جب لڑائی کا وقت
آتا تو ان میں سے ہر ایک لباس فاخرہ کو پرے پھینک دیتا۔ اور ایک سخت
کوش سپاہی کی طرح، میدان میں آتا، اور یہ وہ خصوصیت تھی، مسیحی افسر جس
سے بالکل محروم تھے۔

سلطان محمد نے کرائے کے عیسائی سپاہیوں کو خوب خوب نوازنے اور
انعام و بخشش دینے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اس شاہ خرچ کا مقابلہ غریب
قسطنطین کیسے کر سکتا تھا؟ علاوہ ازیں سلطان محمد کے پاس ماہر فن انجینیروں کی بھی
کمی نہ تھی، انہیں بھی اس نے مالا مال کر دیا، یہی چیز ہنگری کے میر آتش اور
توپ ساز اربن کو یہاں تک کھینچ کر لائی تھی، اگر کوئی سپاہی، افسر یا عالم کسی
طرح کی گستاخی یا نافرمانی کا ارتکاب کرتا تو کسی پاشا یا وزیر کی نوک شمشیر اس کی
پشت میں پیوست ہو جاتی اور وہ وہیں ڈھیر ہو جاتا۔

یہ جوہر تھے جنہوں نے ترک فوج کو دنیا کی سب سے منظم اور بہادر فوج
بنا دیا تھا، یہ دیوانہ وار جنگ میں حصہ لیتے، اور کبھی پیٹھ نہ دکھاتے، درحقیقت
یہ عیسائی نسل سے تھے، جب ترک کسی عیسائی دیہات پر چھاپہ مارتے یا کسی
عیسائی شہر کو فتح کرتے تو ہونہار، مضبوط و توانا بچوں کو الگ کر لیتے، جن کی عمر

پندرہ سال سے کم ہوتی، اور انہیں تربیت کے لئے ایشیا بھیج دیتے، یہ ترک دیہاتیوں کے گھروں میں افراد خاندان کی طرح رہتے، انہیں اسلامی تعلیم و تربیت دی جاتی، ان کے ساتھ بہت ہی اچھا برتاؤ کیا جاتا، بہت جلد یہ بچے اپنے ماں باپ کو بھول جاتے، ترکی فوج میں ان سے بڑھ کر عیسائیوں کے مقابلے میں درشت اور سخت کوئی نہ تھا۔

"ینی چری[1]" بجا طور پر ترکوں کے "طوفانی دستے" تھے، تربیت کا جہاں تک تعلق ہے، وہ پوری سختی سے انہیں دی جاتی، کسی طرح کی رعایت نہ کی جاتی ویسے انہیں اچھے سے اچھا کھلایا جاتا، بہتر سے بہتر کپڑے پہنائے جاتے، فوج میں کسی کو وہ آسائش حاصل نہ تھی، جو انہیں حاصل تھی۔

ان ینی چری سپاہیوں کے لئے ہدایت یہ تھی کہ انہیں ینی چری نئے سپاہی کے نام سے یاد کرو، انہیں خوش رکھو، ان کی فرمائش پوری کرو۔ کہ فتح و ظفر

---

[1] مصنف نے مستشرقین کے روایتی تعصب کی بنا پر نو مسلموں سے حسن سلوک کو غلط رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔ نیز مسلمانوں کی فتوحات کو عیسائیوں کی قربانیوں سے وابستہ کیا ہے، حالانکہ مسلمان خود بہادر بھی تھے اور فن حرب سے واقف بھی اور شوق شہادت سے سرشار بھی۔ انہیں عیسائی بچوں کو محض لڑانے کی خاطر پرورش کرنے کی حاجت نہ تھی۔ (مترجم)

ان کے جلو میں ہو، تاکہ ان کی بُرّشِ شمشیر کے سامنے کوئی نہ ٹھہر سکے، دشمن کے سر پر ان کی تلوار کو شمشیرِ قضا بن کر چمکنے دو، انہیں ہمیشہ خوش و خرم رکھو۔

ینی چری سپاہیوں کی تربیت آج کل کے "کمانڈروز" کی طرح ہوتی، انہیں سخت جسمانی محنت کرنا پڑتی تھی، زمین پر کھودتے، سنگین دیواریں پر کھڑی کر دیتے بھاری سے بھاری بوجھ پر اٹھا لیتے، کارہائے برجستہ و نمایاں پوری بردباری و تحمل سے چشم زدن میں انجام دے ڈالتے، ہر حکم کی تعمیل پر آنکھ بند کر کے کرتے جب کوئی ینی چری آخری طور پر کسی دستے میں شرکت کے لئے نامزد کیا جاتا تو اس کا افتتاح یوں ہوتا کہ کپتان اس کے سر پر چوٹ لگاتا، کہ وہ خون میں لت پت زمین پر آرہتا، لیکن نہ اس کے حوصلے میں فرق آتا نہ عزم میں'۔۔۔

جب ایک ینی چری غیر فوجی حلقوں میں جاتا تو وہ عام آدمیوں کی طرح نہیں جا سکتا تھا۔ ضروری تھا کہ اس کے ہاتھ میں سفید بید کی ایک چھڑی ہو تاکہ وہ آسانی سے شناخت میں آجائے، جنگ کے میدان میں اسے کلاہ سپاہیانہ استعمال کرنا پڑتی، وہ مجبور تھا کہ آدابِ سپاہیانہ کو ہر حالت میں ملحوظ رکھے،

دنیا کا کوئی فوجی نظام بھی بے باکی، جنگی مہارت و قابلیت، فداکاری، سرفروشی، اور اپنے مقصد و حصول میں آسانی سے جان قربان کر دینے میں ترکوں کا حریف آج تک نہیں ہو سکا ہے۔ شروع شروع میں ینی چری (سپاہیوں) کی تعداد چھ ہزار سے زیادہ نہ تھی، لیکن سلطان محمد کے زمانے میں صرف ینی چری

جنہوں نے قسطنطنیہ پر حملے میں حصّہ لیا، ۱۲ ہزار سے زیادہ تھے۔ دشمن (یونانیوں) پر آخری فتح حاصل کرنے میں سب سے بڑا حصّہ سپاہیوں (ینی چری) کا ہوتا تھا دلیری اور بہادری میں انہوں نے اتنی شہرت حاصل کر لی تھی کہ ان کا صرف میدان جنگ میں آجانا دشمن کو سراسیمہ اور دہشت زدہ کر دینے کے لئے کافی تھا،

ترکوں کے اس عظیم لشکر کی نظر میں سب سے زیادہ جو چیز اہمیت رکھتی تھی، وہ مذہب تھا، یہ مذہب کو ذات، وطن، قوم، خاندان، دوست، عزیز سب پر بالا رکھتے تھے، جب سورج غروب ہوتا تو ہر شخص خواہ وہ مزدور ہو یا سالار اعلیٰ دشت وسیع میں فریضۂ نماز ادا کرنے کے لئے حاضر ہو جاتا، سلطان اپنے سجادے پر تلوار سامنے رکھ کر رو بہ قبلہ ہو کر نماز میں مصروف ہو جاتا۔

جمعہ کے روز کہ مسلمانوں کا مقدس اور تعطیل عمومی کا دن ہے، مسلمانوں کے لشکر میں نہ کوئی ڈھاکہ سننے میں آتا نہ کسی قسم کی جنگی تیاری روا رکھی جاتی۔

"جو شخص خدا کی راہ میں جنگ کرتا ہے، یا وہ مرتبۂ شہادت پر فائز ہوگا یا غازی بنے گا۔ ہر حالت میں اسے اجر عظیم بارگاہ خداوندی سے عطا ہوگا"!

ایک مسلمان کے لئے گناہوں کی مغفرت کا اس سے بہتر کوئی اور وسیلہ نہیں، کہ راہ خدا میں لڑتا ہوا جان دے دے، اور سیدھا جنت الفردوس میں پہنچ جائے۔

جنگ شروع ہونے والی رات کو سلطان نے سپاہیوں کے مذہبی جذبہ کو ابھارنے اور راہِ خدا میں جان نثار کرنے پر برانگیختہ کرنے کے لئے درویشوں کو جمع کیا، یہ وجد اور حال میں آکر لوگوں میں ایک نئی روح پیدا کر دیتے تھے ان کی ہر لغزش مستانہ اور ہر گردش رقص ایک مخصوص رمز اور اشارے کی حامل ہوتی تھی،

سیاہ رنگ کی کالی کالی عباؤں میں ملبوس جن کا دامن فراخ ہوتا تھا، دستار سر پہ رکھے ایک طویل قطار کی صورت میں یہ درویش داخل ہوئے اور آہستہ آہستہ سپاہیوں کی طرف جو اشتیاق اور خاموشی کے ساتھ ان کی طرف نگران تھے بڑھے۔

ان درویشوں کا سردار طائفہ طنبورے کی مدھم نغمگی میں ہولے ہولے رقص کناں ہوا، اس نے اپنے ننگے پاؤں کی ایڑی آہستہ سے اٹھائی، اس کا سر جھک کر شانے پر لٹک آیا، اس نے اپنے بازو پھیلا لیے، اس کی آنکھیں نیم وا ہو گئیں، ایک لمحہ تک اس حالت میں درویش نے رقص کیا، اور یکے بعد دیگرے تمام درویش شریک رقص ہو گئے۔ یہاں تک کہ پوری قطار مجموعی طور پہ رقص کرنے لگی۔ ایسا معلوم ہونے لگا جیسے ساری دنیا مصروف رقص ہے۔

ہر لحظہ سرعت کے ساتھ رقص کا زور بڑھتا جاتا، دامن فراخ بالا

ہوجاتا اور افقی خط میں آسمان کی طرف پرواز کناں نظر آتا، حلقہ کی صورت میں تیز تیز گردش کرتے یہ ایک دوسرے کے گرد گھومنے لگے۔ تیز، تیز، بہت تیز، لیکن کیا مجال ہے کہ کسی کا بازو، کسی سے چھو جائے، یا کسی کا دامن کسی کے دامن سے مل جائے، ان کا رنگ رخ بدل جاتا، ان پر جنون اور دیوانگی کی کیفیت طاری ہو جاتی، تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک یہ اسی طرح مصروفِ رقص رہے۔ حلقہ بہ حلقہ تیز، تیز، بہت زیادہ تیز، انہیں اس محویت اور استغراق کے عالم میں یہ بھی محسوس نہ ہوتا کہ زمین ان کے پاؤں کے نیچے ہے، خدا کے سوا کچھ بھی انہیں یاد نہ رہتا۔

سپاہی ان کا یہ رقص، ان کا یہ وجد، ان کی یہ بے خودی دیکھ کر خود ہوش کھو بیٹھتے، خود ان پر جنون کی کیفیت طاری ہو جاتی، اور ہر چیز سے بے پروا ہو کر راہِ خدا میں اپنی گردن کٹانے اور سب کچھ کر گزرنے پر تیار ہو جاتے،

یہ تھی سلطان کی فوج ظفر موج!!

اس فوج میں بارہ ہزار ینی چری تھے، بیس ہزار سوار، ایک لاکھ پیادے بے شمار جنگی قیدی اور بہت سے متفرق لوگ، فرانزا کے تخمینے کے مطابق سلطان کی فوج ڈھائی لاکھ نفوس پر مشتمل تھی۔ جس کے مقابلے میں عیسائی لشکر صرف ستر یا اسی ہزار نفوس پر مشتمل تھا، جو ۱۶ میل کی فصیل شہر سے دفاع کر رہا تھا۔

سلطانی لشکر کے عقب میں ترکوں کی بڑی بڑی توپیں تھیں، دن بھر بیلوں کے گلے انہیں کھینچ کھینچ، پشت غلطہ کی پہاڑی پر چڑھاتے رہے، ترکوں نے انہیں ٹھیک خشکی کی دیوار فصیل کی طرف نصب کر لیا، یہ توپیں دیوار کے تمام طول تک پھیلا دی گئیں ہر چار گوشوں پر، پورے اہتمام کے ساتھ توپ خانہ اشارے کا منتظر تھا۔

ترکوں کے اس کام کو حقیر باور کرانے کے لئے شہنشاہ نے وینس کے ایک ہزار سپاہیوں کو مطلع کیا کہ دیوار شہر پر جمع ہو جائیں اور زور زور سے طبل اور ترہی بجائیں، اپنے پرچم جن پر سینٹ مارک کے شیر کا نشان بنا ہوا تھا، فضا میں لہرائیں، اور خشکی کی دیوار پر ادھر سے اُدھر گشت کریں۔ یہ صرف ایک نمائش تھی۔!

لیکن پھر بھی سلطان محمد یہ منظر دیکھ کر کسی حد تک پریشان ضرور ہو گیا، اپنی فتح مندی اور فیروزمندی پر اسے جو یقین تھا وہ متزلزل ہونے لگا۔

اپنی فتح پر سلطان محمد کا یہ اعتماد کیوں متزلزل ہونے لگا تھا؟

کیا مقدر میں یہ تھا کہ سلطان محمد ایسا فرد فرید ثابت ہو جو ان ناقابل تسخیر دیواروں کو ملبے کا ڈھیر بنا دے یا دوسرے بہت سے سابق قسمت آزماؤں کی طرح وہ ناکام و نامراد رہ جائے گا؟

اپنے زرنگار خیمے میں سلطان رات بھر نہ سو سکا۔ جس پہاڑی پر وہ خیمہ زن تھا وہاں سناٹا چھایا ہوا تھا، بس کبھی کبھی گھوڑوں کے ہنہنانے یا نگہبانانِ لشکر کی صدائے ہوشیار باش سنائی دے جاتی تھی۔

اپنے بہت سے اسلاف کے برعکس سلطان محمد ایک تربیت یافتہ اور عالم شخص تھا، لیکن اس وقت جو کتاب اس کے سامنے کھلی رکھی تھی، بے کلی کے باعث اس پر نظر ڈالنا بھی اسے گوارا نہ تھا،

دفعتہً بے کلی اور اضطراب کے عالم میں وہ اٹھا، اور حکم دیا کہ وزیرِ اعظم خلیل پاشا کو فوراً حاضر کیا جائے۔

خلیل پاشا کو جب حکم ملا تو لرزنے لگا، جانے سے پہلے وہ بیوی بچوں سے رخصت ہوا گویا وہ کسی لمبے اور نامعلوم سفر پر جا رہا ہے، آخر یہ وہی شخص تو تھا جس نے چھ چھ ہفتے کے وقفے سے دو مرتبہ عیسائیوں کو یہاں کی تمام تیاریوں اور تمام رازوں سے باخبر کر دیا تھا، اس نے انہیں جنگ کے لئے تیار رہنے کا مشورہ دیا تھا، اور وہ ہر طرح کیل کانٹے سے اسی بروقت مشورے کے باعث لیس ہو گئے تھے، یہ غداری تھی، وہ عیسائیوں کو دوست رکھتا تھا، بااین ہمہ ان سے بیش قرار انعامات بھی لیتے تھے۔ یہ حرص و طمع کا کمال تھا۔

لیکن جب خلیل پاشا سلطان کے سامنے آداب بجالایا، تو سراپا سکون تھا کسی طرح کا اضطراب چہرے سے ہویدا نہیں تھا۔

یہ رسم تھی کہ رعایا کا کوئی فرد خواہ وہ کوئی ہو جب سلطان کے سامنے حاضر ہوتا تو نذر پیش کرتا۔ خلیل پاشا نے اشرفیوں سے بھرا ایک طشت نوجوان سلطان کے قدموں میں رکھ دیا۔

سلطان محمد نے سر کی جنبش سے نذر قبول کرنے کا اظہار کیا، عام طور پر وہ اپنے وزیر اعظم کا خیر مقدم تبسم اور دل خوش کن باتوں سے کیا کرتا تھا، کیوں کہ وہ ایک خوش طبع شخص تھا، لیکن آج کی رات بہت زیادہ درشت اور تند مزاج نظر آ رہا تھا۔

"میں تم سے ایک بڑی نذر کا متوقع ہوں ——————" سلطان نے سنجیدہ لب و لہجہ میں کہا۔

خلیل پاشا نے سوالیہ لیکن مودب نظروں سے اپنے آقائے ولی نعمت کو دیکھا، اس نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں تم سے قسطنطنیہ کا طالب ہوں!"

سلطان بہت بڑی بہت زیادہ گراں مایہ چیز کا طالب تھا۔ یہ خلیل پاشا کی ذاتی چیز تھی خلیل پاشا اعصابی کھچاؤ دور ہو گیا۔ اس کے لئے کھڑا رہنا مشکل ہو گیا۔ پھر بکھرے ہوئے ہوش و حواس مجتمع کر کے اس نے کہا۔

"سلطان معظم، جس خدا نے آپ کی وسیع مملکت کو اتنی ساری چیزیں عطا فرمائی ہیں کیا وہ ایک شہر آپ کو نہ عطا کرے گا۔! رہا غلام، تو یقین فرمایئے آپ کے فدائیوں اور جاں نثاروں کے پہلو بہ پہلو یہ غلام بھی اپنی جان و مال تک قربان کرنے میں دریغ

نہیں کرے گا!"

سلطان محمد کے چہرے سے اطمینان کے آثار ظاہر ہوئے وہ اسی حوصلہ افزائی کا جویا تھا۔ اس کی بے کلی دور ہو گئی۔

دوسری راتوں میں سلطان محمد بھیس بدل کر لشکر کا گشت کرتا اور معلوم کرتا کہ لوگ آپس میں کیا باتیں کر رہے ہیں اور اس ہونے والی جنگ کے بارے میں کیا خیال رکھتے ہیں؟ اس بدلے ہوئے بھیس میں اگر کوئی اسے پہچان بھی لیتا تو جرأت اظہار نہ کر سکتا۔

سلطان نے اپنے فوجی افسروں سے مختلف پہلوؤں پر بحث و گفتگو کی اور انجینئروں سے سوال و جواب کیے۔ موضوع کلام یہ تھا کہ حملہ کہاں سے اور کدھر سے شروع کیا جائے؟ بارود کہاں بچھائی جائے؟ سنگی دیواروں کا وہ کونسا پہلو ہے، جہاں آسانی سے کارگر حملہ ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی کمزور پہلو ہے تو کہاں ہے؟

کئی مہینے پہلے سلطان نے شہنشاہ کے غدار انجینئر ابرہیم سے پوچھا تھا۔

"کیا تم ایسی اور اتنی بڑی توپ بنا سکتے ہو، جس کا ایک گولہ قسطنطنیہ کی فصیل میں رخنہ کر دے؟"

ابرہیم نے سلطان کو مطمئن کر دیا تھا کہ ایسا ممکن ہے۔ سلطان نے فوراً ہی ادرنہ میں ایک بڑا کارخانہ توپ سازی کیلئے قائم کر دیا۔ جس کا منتظم اعلیٰ اربن کو مقرر کیا گیا۔ اسے اجازت دے دی گئی کہ ضروریات سے متعلق تمام چیزیں ہر قیمت پر اور فوراً خرید لے

اور تین مہینے کی مدت میں اس نے ایسی کوہ پیکر اور گراں ڈیل توپ تیار کر لی کہ اسے دیکھ کر یہ گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ توپ ایسی بھی ہو سکتی ہے، ——————— یہ ہلاکت آفریں ہتھیار ادرنہ سے چل چکا تھا۔!

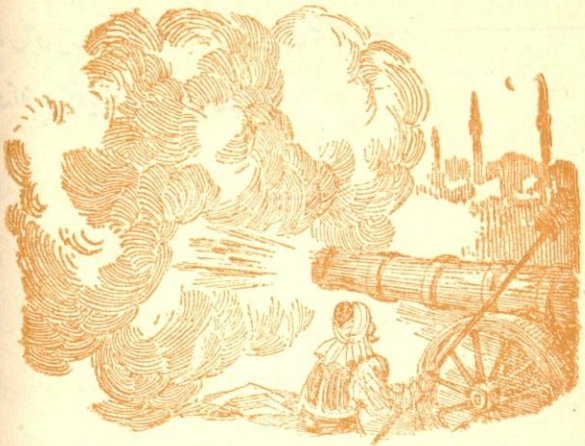

محاصرہ

جیسے جیسے ترک قسطنطنیہ کو گھیرے میں لیتے گیے ، اندرون شہر میں اضطراب و اضطرار بڑھتا گیا ۔

"حملہ کب ہوگا ؟" ——————— لوگ آپس میں ملتے تو ایک دوسرے سے یہی سوال کرتے ، بازاروں میں عورتیں ، شراب خانوں میں مرد ، یہی سوال و جواب کرتے ۔

"کیا حملہ آج تو نہیں ہوگا ؟"

"کیا کل ہم اپنے گھروں میں زندگی بسر کر سکیں گے ۔؟"

پورا موسم سرما یونانی انتہائی مضطرب رہے ۔

بہرحال زندگی کا کاروبار جاری تھا ۔ مرد اب بھی روزانہ کے کام پہ جا رہے تھے ۔ دکانیں بھی کھلی ہوئی تھیں ۔ بازاروں میں سوداگر اب بھی لین دین کر رہے تھے ۔ عورتیں امور خانہ داری کے انجام دینے میں حسب سابق اب بھی مصروف و منہمک تھیں کپڑوں کی سلائی اور رفوگری اور پیوندکاری کا سلسلہ بدستور جاری تھا ۔ تنگ گھروں میں بچے اب بھی اسی ذوق و شوق سے کھیل کود میں لگے ہوئے تھے ۔

اناج کی کمی شدت کے ساتھ روز بروز بڑھتی جا رہی تھی ۔ مغرب سے اناج لائے ہوئے جو جہاز آنے والے تھے ۔ اب تک نہیں آئے تھے ۔ گوشت صرف فوج کے حصہ میں آتا تھا ، وہ بھی بہت کم ۔ روٹی بہ حصۂ برابری سب میں برابر تقسیم کر دی جاتی تھی لیکن شہنشاہ نے اب اپیل کی تھی کہ بوڑھے جوانوں کے لئے اپنے حصے میں کمی کر دیں کیوں کہ جنگ کا سارا بوجھ انہی کی گردن پہ تھا ۔

مردمان شہر میں جو کمزور اور ضعیف لوگ تھے ، وہ دہشت اور خوف سے سراسیمہ نظر آ رہے تھے ۔ حریص اور لالچی لوگ اپنی دولت کو کونے کونے میں چھپاتے پھرتے تھے ۔ غدار اس فکر میں غرق تھے کہ وقت آنے پر جس کا پلہ بھاری دیکھیں گے اس کے ساتھ ہو جائیں گے ۔

لیکن جنگ آزماؤں کی ایک مختصر سی جماعت حرب و پیکار کے لئے بے قرار ہو رہی تھی۔ جیسے جیسے ترک ساز و سامان میدان میں لاکر جھونک رہے تھے، مزاحمت اور مقاومت کا جذبہ تیز ہوتا جا رہا تھا۔ وینس کے پیشہ ور سپاہی جن کے ذمے قصر بلاچرنی کی حفاظت تھی، جیسے جیسے خطرہ قریب تر آتا جا رہا تھا راحت طلب اور بے پروا ہوتے جا رہے تھے۔ جنوی سپاہی جو سب میں زیادہ بہادر اور مشتاق پیکار تھے، بے قراری کے ساتھ جنگ چھڑنے کا انتظار کر رہے تھے۔ جو یونانی وفادار تھے وہ شہنشاہ اور کلیسا کے لئے جان قربان کر دینے کا فیصلہ کر چکے تھے۔

پھر ایسا کوئی دن نصیب نہیں ہوا کہ شہنشاہ اپنے تخت خسروی پر، قصر بلاچرنی میں نشست فرما ہوا ہو، ہر روز وہ گھوڑے کی پیٹھ پر نظر آتا، اور شہر پناہ کے پورے طول میں چکر لگاتا، جنگی تیاریوں کا معائنہ کرتا۔ کام میں لگے ہوئے مزدوروں، کاریگروں اور سپاہیوں کی پیٹھ ٹھونکتا، اور شاباش دیتا۔

جسٹینیانی اور جان گرانٹ بھی شہنشاہ کے ہمرکاب ہوتے، اور فصیل کے کمزور پہلوؤں کو خاص طور پر درست کراتے۔

"دیکھنا یہاں آسانی سے رخنہ ہو سکتا ہے۔ یہاں پشتہ باندھو!" ——

جسٹینیانی نے قصر بلاچرنی اور غلطہ کے باب سینٹ رومانوس کے درمیان دیوار کے ایک حصے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا،

"یہاں دریائے لائسس[1] نے نیچے نیچے زمین کاٹ دی ہے، اور رخنہ پیدا کر کے زیر دیوار سوراخ سا بنا کر بڑی خطرناک اور نازک صورت پیدا کر دی ہے!"

جان گرانٹ نے تائید کرتے ہوئے کہا،

"بالکل ٹھیک ہے، اس کے استحکام پر فوری توجہ کرنی چاہیئے!"

سپاہیوں اور ساز و سامان جنگ کے حصول کے لیئے شہنشاہ نے اپنے کمزور وسائل و ذرائع کے باوجود، جو کچھ زیادہ سے زیادہ ہو سکتا تھا، کیا، اور آخری پائی تک خرچ کر دی، اس زمانے کی دنیا میں کوئی شخص بادی نہیں کر سکتا کہ عظیم بازنطینی مملکت اتنی دیوالیہ تھی کہ اپنی فصیل تک کی مرمت نہیں کر سکتی تھی اور اس بات کا باور کرنا آسان نہیں کہ اتنا دولت مند اور شاندار شہر اپنے مزدوروں کی اجرت تک ادا کرنے سے قاصر تھا۔

لیکن بہر حال یہ اہم ترین فریضہ ہر صورت میں اور ہر قیمت پر انجام دینا تھا۔ شہنشاہ نے دوسرے تمام مصارف روک کر سارا زور اس کام پر لگا دیا۔ اس خرچ میں تخفیف کی وہ حد اڑا دی، یہاں سے عطیہ لیا، وہاں سے قرض کا ڈول ڈالا، یہ چیز فروخت کر دی، وہ سامان بیچ دیا، رعایا پر ٹیکس کا بوجھ جتنا زیادہ لادا جا سکتا تھا، لاد دیا، فرانزا کے دانشمندانہ تعاون سے بالآخر وہ اس قابل ہو گیا

---

[1] LYCUS

کہ اس نے ستر ہزار بازنطینی اشرفیاں جمع کرلیں، یہ رقم فصیل کی مرمت اور استحکام کے لئے مخصوص کر دی گئی۔ کہ یہی آخری امید گاہ تھی ماہرین کا خیال تھا یہ آخری اور اہم ترین دفاعی مورچہ ہے ایک بازنطینی اشرفی بھی اس مقصد عظیم کے سوا کسی اور کام میں صرف نہیں کی جا سکتی تھی۔

آخر میں شہنشاہ نے کلیسا کے دو اسقفوں کو اپنے حضور میں طلب کیا۔ ان میں سے ایک نکوڈیمس[1] تھا۔ یہ روڈز[2] کا رہنے والا تھا۔ دوسرا مینوئل جگاریس[3] تھا۔

یہ دونوں اسقف جامۂ سیاہ میں ملبوس حاضر ہوئے، ان کے چہرے زرد تھے، جوان کی بل کھاتی ہوئی مجبوری داڑھی سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے تھے۔ یہ دونوں خاموشی کے ساتھ سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔

شہنشاہ کے سامنے میز پر جو اس کے اور ان دونوں کے درمیان حائل تھی تھیلیاں رکھی ہوئی تھیں، ان میں سے ایک کیسہ اس نے اٹھایا اور اسقفوں سے کہا۔

---

[1] NICODEMOS

[2] RHODES

[3] MANUEL JACARIS

"ہم چار مہینے سے جو کچھ بھی ہو سکتا ہے کر رہے ہیں، کہ جس طرح بھی ہو قسطنطنیہ کو بچا لیا جائے۔ یہ سنہرے سکے جو ہم نے دفاع ملک کیلئے جمع کیے ہیں، ان تھیلوں میں رکھے ہیں، کہ اس سرمایہ سے کام لے کر کافروں (مسلمانوں) سے ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے۔ یہ رقم میں آپ کے حوالے کرتا ہوں کیوں کہ آپ سے بڑھ کر کون امین ہو سکتا ہے۔؟"

پھر شہنشاہ نے واضح اور صاف طور پر، اس رقم کے مصارف بھی بتا دیئے پھر ایک اسقف نے ایک تھیلی اٹھالی، دوسرے نے دوسری پر قبضہ کیا اور دونوں آہستہ آہستہ قدم رکھتے چلے گئے۔

لیکن سکۂ زر سے بھری ہوئی یہ تینوں تھیلیاں اسی طرح سربمہر رکھی رہیں انہیں دفاع مملکت کے کام میں نہیں استعمال کیا گیا، کئی ماہ بعد جب شہر پر دشمن (مسلمانوں) کا قبضہ ہو چکا تھا۔ چند نئی چہری اس دفینے کو بالکل اتفاقاً زمین کے نیچے سے برآمد کر لینے میں کامیاب ہو گئے۔ ان میں ستر ہزار بازنطینی اشرفیاں جوں کی توں رکھی ہوئی تھیں جو ایک برج کے نیچے دفن کر دی گئی تھیں۔ اسقفوں نے اس رقم میں سے ایک حصہ بھی صرف نہیں کیا، بلکہ اسے اپنی ذات خاص کے لئے محفوظ کر لیا۔ فصیل کے جس حصے کو خاص طور پر "مستحکم" کیا گیا تھا، وہی سب سے پہلے زمین پر آ رہا، جن مزدوروں نے یہاں کام کیا تھا، انہیں مزدوری نہیں دی گئی تھی۔

۱۲ اپریل کو دشمن نے توپوں سے گولے برسانا شروع کر دیے، فصیل کی دیواریں لرزنے لگیں۔

گذشتہ چند ہفتوں سے مردمانِ قسطنطنیہ ترکوں کے لشکر کو جمع ہوتے دیکھ رہے تھے، لیکن کچھ زیادہ ہراساں اور متفکر نہ تھے، لیکن اب دہشت اور سراسیمگی کے باعث ان کے ہوش گم تھے۔ پہلے یہ مسحور تماشائیوں کی طرح فصیل سے چمٹ کر رہ گیے تھے۔ اب گولہ باری کے بعد بے حد اضطراب سے چیختے، فریاد کرتے، ماتم کناں شہر کے کوچہ و بازاروں میں بھاگ رہے تھے۔ یہ سانتا صوفیا میں آکر جمع ہو گیے جس کی ابھی کچھ مدت پہلے یہ خود تذلیل و توہین کر چکے تھے۔ مریم عذرا کی تصویر سر پہ رکھ کر سارے کلیسا میں گشت کرنے لگے۔

لیکن مریم عذرا کی آنکھیں ان خود غرض اور موقع پرست لوگوں سے پھری ہوئی تھیں، اور گولہ باری کی دہلا دینے والی آوازوں کا سلسلہ برابر جاری تھا۔

فصیل پر لڑنے والے سپاہی اور ان کے افسر دفاعِ شہر میں مصروف تھے، گو یہاں سراسیمگی کے آثار اب تک نہ تھے، لیکن کھچاؤ تھا۔ جواب میں مدافعین گولے نہیں پھینک سکتے تھے، کیوں کہ ان کے پاس سازوسامانِ جنگ کی کمی تھی، اور جو کچھ تھا اسے فیصلے کے دن کے لئے محفوظ رکھا تھا۔ جو بالکل سامنے تھا اس

لہ ۱۲ ربیع الثانی

کے علاوہ ایک بڑی مصیبت یہ تھی کہ مدافعین اپنی بھاری توپوں کا بے تحاشا استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ کیوں کہ فصیل کمزور تھی، ہو سکتا تھا کہ اپنی ہی توپوں کے دھماکے سے گر جائے۔

لیکن ابھی بہت سے کارنامے تھے جو لڑنے والوں کے چھوٹے چھوٹے دستے انجام دے سکتے تھے، اور بہادروں کی طرح انھوں نے یہ کارنامے انجام بھی دیے اور اب کہ اقدام و عمل کی گھڑی آگئی تھی، یونانی، اہل وینس، جنوی بغیر کسی استثناء کے جان کی بازی لگانے لگے، شہنشاہ اور اس کا نائب قسطنطین اور جسٹینیانی انتھک طور پر مصروف تھے، ایک لمحے کے لئے ان کی آنکھ نیند سے آشنا نہ ہوئی۔ یہ ہر جگہ تھے، ہر کہیں تھے۔ ہمہ وقت موجود اور سرگرم کار رہتے ——————

جسٹینیانی ہدایت دینے کے لئے، شہنشاہ حوصلہ افزائی کے لئے

دن بھر ترکی توپوں سے گولے برستے رہے، ہر روز، ہمہ وقت، بیرونی دیوار کے بڑے بڑے ٹکڑے لرزتے اور زمین پر گرتے رہے۔

اور جب رات ہوتی، یونانی رینگتے ہوئے آگے بڑھتے اور ٹوٹے ہوئے حصوں کی مرمت کر ڈالتے۔ دن بھر میں جو نقصان پہنچتا، رات بھر میں اس کی تلافی کر دیتے۔ وہ ٹوٹے ہوئے اور گرے ہوئے پتھروں کو اٹھاتے پھر جہاں ممکن ہوتا بڑی ہنرمندی کے ساتھ جما دیتے۔ کمزور مقامات کو گدیلوں اور توشکوں اور اون کے گٹھوں سے بھر دیتے تاکہ لوگوں کی ضرب سہہ سکیں، پھر گائے کی کھال

سے وہ جگہ مڑھ دینے تاکہ مزید مضبوطی آجائے، ہر صبح ہوتے ہی دیوار پھر ویسی کی ویسی نظر آتی جیسی دن کی گولہ باری سے پہلے تھی، بلکہ پہلے سے بھی مضبوط۔

مدافعین کا رخ بدلنے کے لئے ترکوں نے بحری دیوار کی طرف توجہ مرکوز کر دی، اور نردبان بلند کے ذریعہ دیوار پر پہنچنا چاہا، لیکن یونانی تنتظر کھڑے تھے، کھولتی ہوئی رال اور گرم گرم سیسے کا سیال ان کے سروں پر برسانا شروع کر دیئے اور ترک مجبور ہو کر سمندر میں کراہتے ہوئے اور جلتے ہوئے کود پڑتے۔

پھر ترکوں نے زیر دیوار سرنگ لگانے کی کوشش کی۔ گرانٹ نے ٹک ٹک کی آواز سن لی، بھاگا بھاگا قصر بلاچرنی پہنچا،

"اعلیٰ حضرت ذرا تشریف لائیے"!

اس نے شہنشاہ سے استدعا کی، "ذرا تشریف لائیے"۔ اب ان میں ایک شہنشاہ اور دوسرا ملازم نہ تھا، دونوں رفیق کار، اور ساتھی تھے۔ دونوں کے درمیان تکلفات اور مراسم کے پردے ہٹ گیے تھے۔

شہنشاہ گھوڑے پر سوار تھا، گرانٹ کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ جب یہ دونوں دروازۂ عج کے پاس پہنچے، جو قصر بلاچرنی اور باب سینٹ رومانوس کے درمیان تھا، تو دونوں کھڑے ہو گیے۔

جان گرانٹ گھوڑے سے اترا، کان زمین سے لگا دیے، اور اس کا بھرا بھرا جرمن چہرہ بے چینی سے سرخ ہو رہا تھا۔ "ٹولا سنئے"!

زمین کھودنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی، جرمن گرانٹ نے زہر خند کرتے ہوئے اپنا منصوبہ شہنشاہ کے گوش گزار کیا۔

مدافعین نے رات کا انتظار بھی نہیں کیا اور سرنگ میں گندھک بھر کر دھواں پھیلا دیا۔ تاکہ جو سرنگ میں ہو یا داخل ہو، دم گھٹ کر مر جائے۔

ترکوں نے چودہ مقامات پر دیوار میں نقب لگانے کی کوشش کی لیکن ہر جگہ ہر موقع پر یونانیوں نے ان کی کوشش ناکام بنا دی۔ یونانیوں نے گندھک مواد متعفن، آگ سے اور کھولتے ہوئے پانی سے یہ حصے بھر دیے۔ ایک مرتبہ نقب کے اندر ترکوں اور یونانیوں کی مڈبھیڑ ہو گئی اور دست بدست جنگ اندرون نقب فرش زمین سے نیچے شروع ہو گئی، لیکن دشمن پھر بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔

مدافعین پورے طور پر چوکس تھے، البتہ ایک مشکل یہ تھی کہ راتیں چھوٹی ہوتی تھیں، اب مرمت کا کام اتنا بڑھ گیا تھا، اور حملے اتنے شدید اور زیادہ ہونے لگے تھے، کہ راتوں رات ان کی تلافی میں دشواری پیش آنے لگی، فصیل کی بیرونی دیوار حملوں کی تاب نہ لا کر لرزنے لگی، اور باشندگان شہر کے دل بھی دھڑکنے لگے بجائے اس کے کہ یہ لوگ مدافعین کی مدد پر کمربستہ ہوتے، پادریوں اور اسقفوں کی طرح گرجاؤں میں جا کر چھپ رہے۔

اٹھارہ[1] اپریل کو جب کہ گولہ باری چھ دن سے مسلسل جاری تھی، ایک بہت بڑا شگاف دیوار میں پڑ گیا۔ اور دو برج گر پڑے۔

یہ بات سلطان محمد کے لئے فال نیک ثابت ہوئی، اب اس کا موقع تھا بے درنگ حکم دیا کہ فوراً حملہ کر دو۔

19 اپریل کی رات کو ترکوں کی فوج جو پیادوں اور سواروں پر مشتمل تھی، سرخ رنگ کی فیض ٹوپیاں پہنے، نیزے بڑھائے، تیغ اٹھائے، پیش قدمی کرتی ہوئی بڑھی، ان کے نیزوں میں بڑے بڑے کنڈے لگے تھے، ان سے انہوں نے وہ توشکیں، گدیلے، تکیے، روئی کی گانٹھیں اور اون کے گٹھڑ نکال پھینکے، جو شگافِ دیوار کو پُر کرنے کے لئے بھر دیئے گئے تھے، اور پھر ان میں آگ لگا دی، اور پھر ترکوں نے کوشش کی دیوار پر چڑھ جائیں، لیکن جسٹینیانی اور اس کے آدمیوں نے انہیں پیچھے دھکیل دیا۔

زخمیوں کی آہ و نالے کی صدائیں گھروں میں پہنچ رہی تھیں، جہاں عورتیں مریم عذرا کی تصویر کے سامنے مصروف دعا تھیں۔

رات بھر کوئی نہ سو سکا۔

چار گھنٹے تک نہایت شدت کے ساتھ جنگ شبانہ جاری رہی۔ ترکوں

---

[1] ۸ ربیع الثانی

کے دو سو آدمی مارے گیے۔ سلطان محمد کو مجبوراً واپس ہو جانا پڑا۔ بڑے خشم آلود لہجے میں اس نے اس پسپائی کو شکست قرار دیا۔ اس نے گرجتے ہوئے کہا۔

"ایک لاکھ مسلمان فوج کو ان تھوڑے سے عیسائیوں نے روک لیا۔؟"

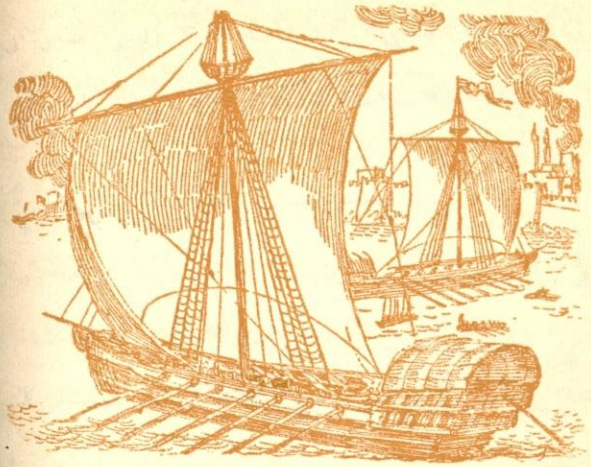

ترکوں کی لرزہ خیز شکست

ترکوں کا دوسرا حملہ سمندر کی طرف سے ہوا، ترک یوں تو ہر طرح سے مرد میدان تھے، لیکن ان کی بحری قوت بہت کمزور تھی۔ اگر اللہ نے انہیں زمین کی مملکت سونپ دی تھی تو اقلیم بحر عیسائیوں کے لئے چھوڑ دی تھی، ترک سمندر سے دور کے صحرا نشین تھے، وہ سمندر اور بحری راستوں سے قطعی بیگانہ تھے۔ گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھنے کے فن میں یکتا تھے، لیکن کشتی رانی اور جہاز

سازی کے فن سے بیگانہ، مگر سلطان محمد نے اس کمزور پہلو سے ہراساں ہو کر ہمت نہیں ہاری، اس نے قسطنطنیہ کو اپنے محاصرے کے پنجے میں بری طرح جکڑ لیا تھا قریب تھا کہ مردمان شہر بھوک سے نڈھال ہو کر مر جائیں۔ ابھی تک یہ ممکن تھا کہ مغرب سے سامان خوراک و اجناس اور سپاہیوں سے بھری ہوئی کشتیاں آجائیں تو شہر بچ سکتا تھا، اور ترکوں کو شکست بھی دی جا سکتی تھی۔

اس ہنگامی صورت حال سے جو ہر وقت ممکن تھی، سلطان محمد بے خبر اور بے پروا نہ تھا، اس نے جیسے تیسے ایک بحری بیڑا فراہم کیا۔ مصر، شام اور بالائے باسفورس سے، اور ہر بندرگاہ سے جتنی کشتیاں بھی ممکن ہو سکیں، منہ مانگے دام دے کر خریدیں یا کرائے پر لیں۔ اس طرح تقریباً تین سو کشتیاں جمع ہو گئیں، لیکن کشتیوں کے اس مجموعے کو بحری بیڑا نہیں کہہ سکتے تھے یہ ساری کشتیاں چھوٹی اور کھلی ہوئی، اور غیر مسلح تھیں۔ صرف ۱۸ کشتیاں ایسی تھیں جن میں سپاہی بھرے ہوئے تھے۔ لیکن ان پر بھی کوئی توپ نصب نہیں تھی۔

دشمن کی کشتیاں قسطنطنیہ کی جانب غیر منظم اور نامرتب طور پر نقل و حرکت کرنے لگیں۔ مخصوص ترکی انداز میں ان کے سوار طبل اور قرن بجا رہے تھے۔ نعرے لگا رہے تھے۔ یہ کشتیاں سدہ شناور سے باہر بندرگاہ کے دہانے پر ہلال کی صورت میں مجتمع ہو گئیں۔

ایک مرتبہ پھر قسطنطنیہ کے باشندے فصیل پر چڑھ کر ان کشتیوں کی

آمد و رفت کا منظر دیکھنے لگے۔

بندرگاہ میں شہنشاہ کا بحری بیڑا خوف اور اضطراب کے عالم میں تھا۔ دس مہینے پہلے جب شہنشاہ نے محسوس کیا تھا کہ سلطان محمد جنگ پہ اڑا ہوا ہے تو اس نے جنوا اور وینس سے رسد اور جنگی کشتیوں کا بندوبست کیا تھا۔ اس نے یہ بیڑا عیسائیت کے نام پر طلب کیا تھا، اور اس سے وعدہ کر لیا گیا تھا کہ رسد اور کشتیاں اس کے پاس پہنچ جائیں گی۔ یہ واقعہ ۱۴۵۲ء کا تھا۔ اب اپریل ۱۴۵۳ء شروع ہو چکا تھا، لیکن موعودہ کشتیاں اب تک جنوا اور وینس سے نہیں پہنچی تھیں۔

لیکن ٹھیک اس موقع پر جب عیسائیوں کی امید یاس سے بدل چکی تھی، ان پر بددلی اور سراسیمگی کے آثار نمایاں تھے، کنارِ افق سے کوئی چیز ابھرتی سی نظر آئی، یونانی فصیل پر چڑھے، ماتھے پر ہاتھ رکھے، تیز نظروں سے سمندر کی طرف گھور رہے تھے۔ کہ یہ کیا ہے؟ یکایک انہوں نے دیکھا کہ پانچ بڑے، بڑے جہاز ہیں جو دور دراز فاصلے سے کہر کی چادر پھاڑتے اسی طرف آ رہے ہیں۔ ایک کے بعد ایک جہاز اپنے عرشۂ بلند اور لہراتے ہوئے بادبانوں کے ساتھ نمایاں ہوا۔

جوشِ مسرت سے بیتاب ہو کر مردانِ شہر نے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ آخر کار جہاز اور قریب آ گئے، اور یقیناً یہ اناج سے بھرے ہوئے

ہوں گے ۔ شراب اور روغن کے پیپے بھی ان کے ساتھ ضرور ہوں گے ، عرشے پر تازہ دم سپاہی ہوں گے اور جہاں گرد ملّاح اور تجربہ کار ناخدا بھی ۔ شہر کے باشندوں کو مایوسی کی تاریکی میں امید کی کرن نظر آئی ۔ ان میں ایک نیا جوش پیدا ہو گیا ۔ جوش سے بے خود ہو کر تالیاں بجانے اور ٹوپیاں اچھالنے لگے ۔ بچوں کو گود میں لے کر اور کندھے پر بٹھا کر یہ "تماشہ" دکھانے لگے ، انہوں نے افق پر نگاہیں گاڑ رکھی تھیں ، کہ آیا ان جہازوں کے پیچھے اور بھی جہاز ہیں یا نہیں ؟ لیکن ان پانچ کے سوا اور کوئی جہاز نہیں نظر آیا ۔ دشمن کی تین سو کشتیوں کے مقابلے میں پانچ جہاز !

لیکن یہ پانچ جہاز مردانِ جنگی سے بھرے ہوئے تھے ۔ ان میں سرد و گرم چشیدہ سپاہی آمادۂ پیکار کھڑے تھے ۔ ترکوں کی کشتیاں نیم دائرے کی صورت میں متوقف کھڑی تھیں ، یہ جہاز ان کی طرف پوری دلیری کے ساتھ بڑھے ۔

بعد میں معلوم ہوا کہ یہ جہاز سخت طوفانی ہوا کے باعث وقت پر نہ پہنچ سکے مارچ سے لے کر اپریل تک اسی طرح یہ موجوں کے رحم و کرم پر ادھر سے ادھر بھٹکتے رہے ، آخر ۲۰ اپریل کو ان کی آنکھوں نے کلیسائے سانتا صوفیا کے گنبدوں کا نظارہ کیا جو ہنگامِ طلوعِ آفتاب میں صاف نظر آ رہا تھا ۔

لیکن اب بادِ مخالف ختم ہو چکی تھی ، یہ جوشِ مسرت سے بے قابو اپنی منزل مقصود تک پہنچ گئے ، یہ پانچوں جہاز پیکانِ فضا بن کر ترکی کشتیوں پر حملہ آور

ہوئے۔

ہزاروں تماشائی ساحل پر کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ شہر پناہ سے غلطہ کے یورپی ساحل اور ایشیائی کنارے پر بے شمار عیسائی اور مسلمان اس منظر کے دیکھنے میں محو تھے۔

سلطان محمد کو جیسے ہی یہ خبر ملی فوراً گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا دو میل کا فاصلہ طے کر کے موقع واردات پر پہنچ گیا تاکہ دیکھے کیا ہو رہا ہے۔

عیسائی جہاز قریب تر ہوتے جا رہے تھے، یہ چونکہ بلند تھے، لہٰذا قدرتاً انہیں چھوٹی اور پست کشتیوں پر تفوق حاصل تھا۔ انہیں نیزہ پھینکنے میں، وار کرنے میں اور دباؤ ڈالنے میں بہت زیادہ سہولت حاصل تھی۔ ان جہازوں کے جہاں دیدہ اور تجربہ کار ملاح اور ناخدا، بہت اچھی طرح جارحانہ حملے کے لیے بھی تیار تھے، اور دفاع کے لیے بھی، ان کی زرہ اور پوشش، نیچی کشتیوں سے چلے ہوئے تیروں کو آسانی سے روک لیتی تھی۔ دشمن (مسلمان) کی طرف سے جو آتش ریزی ہوتی تھی اس کا توڑ پانی سے بھری ہوئی بالٹیوں اور ڈولوں کی صورت میں ان کے پاس موجود تھا۔ ان کے ہاتھوں میں بڑے بڑے کلہاڑے تھے جن سے ہر اس شخص کا جو عرشے پر چڑھنا چاہے یا ہاتھ قطع کر دیتے تھے، یا گردن قلم کر ڈالتے تھے۔ یہ مجنونانہ جوش کے ساتھ سیدھے کشتیوں کی طرف بڑھے چلے جا رہے تھے۔

اور اب کہ سورج پورے طور پر طلوع ہو چکا تھا، ہوا کے جھکڑ ختم ہو چکے تھے، کشتیوں اور جہازوں کا ہلنا ڈولنا بند ہو گیا۔ صحیح معنی میں جنگ شروع ہو گئی۔ ترکی کشتیوں نے ان جہازوں کو گھیرے میں لینا چاہا، لیکن جنوبی سپاہیوں نے بادبانوں کی آڑ لے کر تیروں اور نیزوں کی بارش شروع کر دی۔ اپنے بڑے بڑے جہازوں کے بلند و بالا عرشے سے بڑے اطمینان اور بے خوفی کے ساتھ پتھروں کے بڑے بڑے ٹکڑے ان کشتیوں پر جو ان کے مقابلے میں کہیں نیچی تھیں، پھینک رہے تھے۔

نتیجہ تباہ کن تھا، فصیلِ شہر پر کھڑے ہوئے یونانی کشتیوں کو ڈوبتے اور دشمنوں کو غوطے کھاتے دیکھ کر خوشی سے دیوانے ہوئے جا رہے تھے۔ جو ترک سمندر میں جا پڑے اور تیرنے کی کوشش کر رہے تھے، وہ اب پورے طور پر عیسائیوں کے رحم و کرم تھے۔ سمندر، کشتیوں، جہازیوں اور ڈوبتے ہوئے آدمیوں سے پٹا پڑا تھا۔ پانی کا نظر آنا مشکل ہو رہا تھا۔

تین گھنٹے تک یہ جنگ جاری رہی۔!

سلطان محمد ساحل پر کھڑا تھا، اور انتہائی برہمی کے عالم میں ان آشفتہ حال ترکوں کو "بزدل" اور "احمق" کے خطابات دے رہا تھا۔

سلطان محمد نے اعلان کیا جو شخص دشمن کے جہاز پر چڑھ جائے گا، مالا مال کر دیا جائے گا۔ اس نے بھاگنے والوں کو دھمکیاں دیں۔ برہمی کے عالم میں گھوڑے

پر بیٹھ کر سیدھا سمندر کے اندر تک چلا گیا، اس کی لمبی عبا پانی میں شرابور ہو گئی۔ اس کی زبان پر ایک ہی کلمہ جاری تھا۔

"خبردار! دشمن بندرگاہ میں داخل نہ ہونے پائے۔" پھر اس نے اپنے امیرالبحر سے کہا "اور اگر تم اسے نہیں روک سکتے تو زندہ مت واپس آنا!"

امیرالبحر سے جو کچھ ہو سکا اس نے کیا، اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ ہر قیمت پر دشمن کے جہازوں پر چڑھ جائیں، اور خود اپنی چھوٹی اور نیچی کشتی میں بیٹھ کر اطالوی جہاز کی طرف بڑھا۔

لیکن سلطان کو اس محاذ پر کامل شکست ہوئی۔ اس کی تین سو کشتیوں کا پورا بیڑہ تباہ ہو گیا۔ بارہ ہزار آدمی کام آئے، ان میں کئی مایۂ ناز سورما تھے۔ گو سلطان کا امیرالبحر اس جنگ میں کارنمایاں دکھاتا ہوا بری طرح زخمی ہوا، اس کی ایک آنکھ بھی جاتی رہی، لیکن سلطان نے اسے تمام اعزازات اور مناصب سے محروم کر دیا اور اس کی تمام املاک ضبط کر لی۔ وہ اسے قتل کرنے پر تلا ہوا تھا۔ سعی و سفارش سے زندگی تو بچ گئی، لیکن ذلت اور خواری سے نہ بچ سکا۔ غلاموں نے اسے گھسیٹ کر زمین پر ڈال دیا، اور ایک سنہری چھڑی سے خوب مارا۔

عیسائیوں کا ایک آدمی بھی ضائع نہ ہوا، غروب آفتاب کے بعد طوفانی ہوا نے پھر زور باندھا۔ وینس کے جہاز رانوں نے اپنے جہاز سنڈ شنادر کی طرف بڑھائے، اور بندرگاہ میں داخل ہو گئے، یہاں پہنچ کر انہوں نے تمام سامان، روغن،

شراب، اناج، اجناس اور سپاہی اتار دیئے۔

فتح کی خوشی سے سرشار ایک چھوٹی سی یونانی کشتی سمندر میں آگے بڑھتی چلی گئی کہ دیکھیں یورپ سے موعودہ جہاز آرہے ہیں، یا نہیں؟ اس کشتی کا بارہ یونانی منچلے ترکوں کا بھیس بدل کر، انہی کا لباس پہن کر، انہی کا پرچم ہاتھ میں لے کر سوار ہوئے کیونکہ سمندر میں کہ اب تک ترکوں ہی کی عملداری تھی، اس طرح وہ مزاحم نہ ہو سکے۔

اندرون شہر لوگوں کا جوش مسرت تمام حدود و قیود سے ماورا ہو چکا تھا۔ چھ مہینے کی مدت میں پہلی مرتبہ آج پھر باشندگان قسطنطنیہ کو اس سرخوشی کے موقع نے متحد کر دیا تھا۔

یہ بڑی شاندار جنگ تھی، جو لڑی گئی۔ بجا طور پر اسے ایک اہم اور یادگار موڑ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ جو لوگ فتح کے نشے میں سرشار تھے، انہیں شکست فاش سے دوچار ہونا پڑا، بارود خانے کچھ کام نہ دے سکے، سرنگیں بیکار گئیں، جان توڑ حملے ناکام ہوئے۔ یورپ سے آئے ہوئے جہازوں نے فیصلہ کر دیا، سلطان محمد کی سال بھر کی شبانہ روز کوشش کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ محاصرہ اٹھا لینے اور پسپائی اختیار کرنے پر تیار ہو گیا۔ خلیل پاشا سلطان کا "مشیر باتدبیر" عیسائیوں کو وفادار دوست اپنے عیسائی دوستوں کی ظفرمندی کا پورا یقین رکھتا تھا، اس حادثے نے جو سلطان کے لئے اتنا مایوس کن تھا اسے نشاط و سرور سے معمور کر دیا۔ اس نے سلطان کے اس فیصلے کی تائید کی۔ اس نے کہا۔ "واقعہ یہ ہے کہ قسطنطنیہ کسی طرح سر نہیں کیا جا سکتا

"بجز اس کے کہ دو طرفہ حملہ کیا جائے، ایک بندرگاہ کی طرف سے، دوسرا خشکی کی جانب سے، چونکہ بندرگاہ شاخ زریں ناقابل تسخیر ہے، اور اس کا تجربہ بھی ہو چکا ہے، لہٰذا اس طرف سے کامیابی کی امید کرنا ایک ناممکن آرزو کرنا ہے۔ سد شاور ناقابل عبور ہے اور اب اسے مزید مستحکم کر دیا گیا ہے۔ یہ پانچ جہاز شب و روز اس کی حفاظت کر رہے ہیں، اور ان جہازیوں کی قوت و طاقت کا اندازہ بھی ابھی ہو چکا ہے۔"

خلیل پاشا نے یہ باتیں کیں اور درد دیدہ نظروں سے اپنے آقائے ولی نعمت کو دیکھا۔

نوجوان سلطان پر اس وقت کچھ عجیب سی کیفیت طاری تھی، آیا اسے مایوسی سے تعبیر کیا جائے یا برہمی سے، یہ سنجیدگی تھی یا نہ ہر خند؟ خلیل پاشا کوشش کے باوجود اندازہ نہ کر سکا۔

شاید سلطان خلیل پاشا کی ناوفادارانہ باتوں کے بین السطور سے اپنے لئے ایک کام کی بات اخذ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ شاید اپنے مخصوص پر اسرار انداز میں اس نے کوئی راستہ اپنے لیے منتخب کر لیا تھا۔

شہر پر اس وقت تک قبضہ نہیں کیا جا سکتا جب تک
اس پر دو طرف سے حملہ نہ کیا جائے، ایک سمندر کی
طرف سے، دوسرا خشکی کی جانب سے۔

دوسرے دن ایک سو گولے سدشناور پر برسائے گیے، کچھ گولے غلطہ پر بھی پھینکے گیے۔ یہ بات شک و شبہ سے بالا تھی کہ یہ اقدام خوف زدہ کرنے کے لئے کیا گیا ہے گو مسلسل دھماکوں سے اہالیان شہر سہم گیے لیکن ان کا شوق نظارہ کشاں کشاں انہیں ایک مرتبہ پھر ساحلی دیوار کی طرف لے گیا' اور وہ اس پر چڑھ کر دیکھنے لگے کہ اب دشمن کیا کرتا ہے ؟———— کیا کرنا چاہتا ہے ؟

لیکن انہوں نے جو کچھ دیکھا یہ کسی آدمی کا کام تو کسی طرح نہیں ہو سکتا تھا'———— وہ تو کہیئے بہت جلد چادر شب نے ہر سُو پھیل کر چار سُو اندھیرا کر دیا۔ جس سے یہ بلا ٹلی اور معجزانہ طور پر نجات مل گئی۔

غلطہ کی پشت پر جو پہاڑی تھی، قصر بلاچرنی اور دیوار شہر کے بالکل سامنے انہوں نے دیکھا کہ جہاز خشکی پر چڑھے چلے آ رہے ہیں!———— تیس انتیس، چالیس ایک کے بعد ایک، ایک کے پیچھے دوسرا، ان کی رفتار سست تھی بہت زیادہ سست، لیکن عزم و استقامت کے آثار نمایاں تھے، پہاڑوں کے نیچے اور بندرگاہ شاخ زریں کے اندر یہ جہاز پہنچ چکے تھے، چالیس، پچاس، ساٹھ!.......... !

سلطان محمد نے جوش و خروش کے عالم میں ایک حیرت انگیز منصوبے پر عمل کیا - یہ عمل اسی تیزی سے جو اس کے مزاج کی خصوصیت تھی ظہور پر آیا۔ اس نے راتوں رات اپنے ایک خاص منصوبے پر چپکے سے عمل کر ڈالا۔ ممکن ہے یہ منصوبہ خفیہ طور پر ایک مدت دراز سے اس نے بنا رکھا ہو مگر اس کے متعلق کوئی کچھ نہیں جانتا۔

بڑے بڑے شہتیر جو گائے اور بھیڑ کی چربی سے خوب اچھی طرح تر کر لیے گئے تھے، غلطہ کی زمین پر ڈال دیئے گئے، اور کشتیاں ان پر سے پھسلا کر خشکی پر اتار دی گئیں، انہیں آدمی بھی کھینچ رہے تھے اور بھینسے بھی، دو دو رہنما ہر کشتی کے آگے اور پیچھے چل رہے تھے، اور بادبان ہوا کے رخ پر کھول دیے گئے تھے۔ یہ ایک محیر العقول کارنامہ تھا، جس کی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی۔

جیسے ہی یہ کشتیاں زمین پر اور دامن کوہ میں اتریں، ترک جوش سے بے قابو ہو کر نعرے لگانے لگے، اور نغمۂ فتح گانے لگے۔

اس طرح صرف ایک رات میں صرف اسّی کشتیاں باسفورس سے رومیلی حصار پہنچ گئیں، اور خشکی کے اس حصہ سے شاخ زریں کی بندرگاہ میں داخل ہو گئیں۔ یہ بہت بڑی اور فیصلہ کن تدبیر تھی، کیوں کہ اب سلطان نے یونانیوں کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ اپنے مثلث کا دو کے بجائے تین طرف سے دفاع کریں، اس نے غلطہ کے جنوبی سپاہیوں کو بھی اس حیثیت میں لا ڈالا تھا، کہ اگر وہ چاہتے، تو بھی محصورین کی مدد کرنے سے قاصر رہتے اور خود اس کا سلسلہ مواصلات فوجی کیمپ سے رومیلی حصار تک اس طرح مختصر ترین ہو گیا تھا۔

سلطان یہ مافوق الانسان کارنامہ ہرگز انجام نہ دے سکا ہوتا، اگر جنوی کاریگروں اور فن کاروں نے اس کی مدد نہ کی ہوتی، انہوں نے نہ صرف یہ کہ سلطان کو اپنے علاقے سے گزرنے کی اجازت دی، بلکہ اس کے ہاتھ منہ مانگے داموں پر، رسیاں، رولر اور

روغن گوسفند بھی فروخت کیا۔

یہ تھا شہنشاہ کا دشمن ——————— دولت مند، قوت و رعب با تدبیر اور وسائل و ذرائع کا مالک!۔

اور یہ تھے شہنشاہ کے عیسائی ساتھی، دوست، اور ہم قوم ——— ناوفادار، لالچی، اور تاریخ کے فیصلہ کے مطابق انتہائی احمق'!

خشکی پر کشتیاں اتارنے کے دوسرے دن شہنشاہ اور جسٹینیانی پس دیوار کھڑے ہو کر بندرگاہ شاخ زریں کی طرف دیکھنے لگے۔

فصیل شہر کا یہ سب سے زیادہ بودا اور کمزور حصہ تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ پہلے یہاں سرے سے دیوار ہی نہیں تھی، کیوں کہ بندرگاہ سے اس طرف کی بہت اچھی طرح حفاظت اور نگہداری ہو سکتی تھی، لیکن اب یونانی کھڑے دیکھ رہے تھے۔ کہ تحفظ اور سلامتی کو خطرہ لاحق ہو چکا تھا۔ کافروں کی کشتیاں اب اس مقام پر پہنچ چکی تھیں یہاں اس سے پہلے کبھی دشمن (مسلمان) قدم دھرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔

"ان کشتیوں کو نابود کر دینا چاہیئے'!" ——————— جسٹینیانی نے سرگوشی کی'

غلطہ کے بار انداز کی طرف جدھر وہ نظر جمائے ہوئے تھا، انتہائی جوش و خروش کا منظر تھا۔ صبح دم ترکوں نے ایک پل کی تعمیر شروع کر دی کہ بندرگاہ کو غلطہ سے پشت دیوار کے ساتھ جانب شمالی ملا دیں، اب تک کہ ساری رات گزر چکی تھی، ترک

اپنے کام میں مشغول تھے، بڑے بڑے کنستر رسیوں سے باندھ کر ایک قطار سی بناتے چلے جا رہے تھے۔ چیونٹیوں کی طرح پوری تیزی، مستعدی اور گرم جوشی کے ساتھ یہ جا رہے تھے، آ رہے تھے، بوجھ لاد رہے تھے، بوجھ اتار رہے تھے، شہنشاہ اور جسٹینیانی کا فیصلہ اور زیادہ اٹل اور مستحکم ہو گیا، انہوں نے ایک راہ عمل طے کر لی۔ نکولا شہنشاہ کا نگہبان خاص مامور کیا گیا کہ محکمہ دفاع کے بارہ سربراہوں کو فوراً حاضر کرے۔ یہ لوگ حکم پاتے ہی قصر بلاچرنی میں آموجود ہوئے۔ جلسۂ مشاورت بالکل رازدارانہ طور پر شروع ہوا، کسی طرح کے آداب و رسوم ملحوظ نہیں رکھے گئے،

چار راتیں گزرنے کے بعد جیسا کہ مجلس مشاورت میں طے ہوا تھا، ——— مدافعین نے جوابی حملہ کیا، بحر اسود کی طرف کے ایک ناخدا جیمز کوکو[1] کا نقشۂ جنگ منظور کر لیا گیا، جو یہ تھا کہ دشمن پر ناگہانی حملہ کر کے اس کی کشتیوں کو جلا کر خاکستر کر دیا جائے، جتنے آدمیوں کی اس کام کے لیے ضرورت تھی انہوں نے رضا کارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کر دیں، کوکو نے بذات خود حملہ کرنے کی ذمہ داری قبول کر لی،

طلوع آفتاب سے دو گھنٹے پیشتر دو مسلح شاہی کشتیاں جن پر وینس کے سپاہی سوار تھے اور تمام ضروری ساز و سامان آتش افروزی مہیا تھا، نہایت خاموشی کے ساتھ بغیر کسی طرح کی آواز پیدا کیے۔ اپنے لنگر گاہ سے منزل مقصود کی طرف روانہ

---

[1] JAMES COCO

ہوئیں، لیکن جیسے ہی انہوں نے جنبش کی غلطہ کے برج سے ایک چمک پیدا ہوئی، اور ہر طرف روشنی پھیل گئی، یہ کشتیاں فوراً رک گئیں، بادبان گرا دیے گئے، کوکو جمز آگے بڑھنے کے لئے بیتاب تھا۔ یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ یہ چمک ترکوں کی طرف سے انتباہ ہے، چنانچہ پھر اس نے تاریکیٔ شب میں بندرگاہ کی طرف بڑھنا شروع کیا۔

دفعتہً توپ کی گرج کے ساتھ تین کشتیاں حرکت میں آگئیں، کوکو کی کشتی جو سب سے آگے تھی فوراً ہی معدوم ہو گئی اور کوکو ہلاک ہو گیا۔ پھر سب سے بڑی کشتی پر حملہ کیا گیا اور وہ بھی ناکارہ ہو گئی،

بدقسمتی سے غلطہ کے رہنے والے بعض جینویوں نے یہ راز سلطان محمد ثانی پر آشکارا کر دیا تھا۔ کشتیوں پر سے ترکوں کے قہقہوں کی آوازیں رات کے سناٹے میں گونج رہی تھیں۔

دو یونانی کشتیاں باقی رہ گئی تھیں، ان پر ترکوں کی اسّی کشتیوں سے گولہ باری شروع ہو گئی۔ لیکن یونانی کشتیاں بھی مسلّح تھیں، اور گو ان کی تعداد کچھ نہ تھی مگر یہ دشمن کے قابو میں نہ آئیں، جنگ صبح تک ہوتی رہی۔ اس کے بعد یہ دونوں کشتیاں اپنے آدمیوں کو سلامت لے کر لنگرگاہ پہنچ گئیں

لیکن دوسری کشتی کے ملاح واپس نہیں پہنچ سکے۔ دوسری کشتیوں کے لوگوں نے انہیں سمندر میں تیرتے ہوئے اور ساحل کی طرف آنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھا مگر جب تمام لوگوں کا شمار کیا گیا تو چالیس نفوس کم تھے۔!

شہنشاہ نے شب کو بستر کا رخ بھی نہیں کیا، وہ مریم عذرا کے بت کے سامنے دوزانو ان چالیس آدمیوں کی سلامتی کی دعا مانگ رہا تھا، اسی حالت میں صدائے فریاد و فغاں اس کے کانوں تک پہنچی۔

زن پیش خدمت اپنے آقا کا ناشتہ لائی، یہ اسی کی چیخ تھی جو شہنشاہ نے سنی تھی، اوروں نے بھی یہ چیخ سنی تھی ——— خوفزدہ بیویوں اور ماؤں نے جن کے شوہر اور فرزند رات کو دشمن پر حملہ کرنے کے لئے باہر گئے تھے، اور پھر واپس نہیں آئے تھے، اب یہ عورتیں شہر پناہ کی طرف ہجوم کر رہی تھیں، اور وحشت و حسرت کے عالم میں بندرگاہ کی طرف تک رہی تھیں۔

ساحل کے دوسری طرف ایک چوب بلند پر چالیس کٹے ہوئے سر لٹک رہے تھے یونانی فصیل پر لوٹے پڑ رہے تھے۔ یہ جگر خراش منظر دیکھ کر ان کی صدائے نالۂ آسمان تک جا رہی تھی۔ شہنشاہ اپنے گھوڑے پر سوار یہ منظر چپ چاپ دیکھ رہا تھا۔ وہ یہاں مغموم و ملول کھڑا تھا، اور تنہا تھا، غم نے اسے نڈھال کر دیا تھا کہ دفعتہً ہتھیاروں کے ٹکرانے کی آواز نے اسے عمل اور فیصلے کی دنیا میں پہنچا دیا۔

جبریل ٹریویزانو[1] جو یونانی جہازوں کا ناخدا تھا، شہنشاہ کے سامنے حاضر ہوا۔ یہ ایک پستہ قد موٹا اور بے ہنگم سا شخص تھا، مسلسل سمندری زندگی گزارنے

---

[1] GABRIAL TRIVISANO

اور مرطوب و شور علاقہ میں زندگی بسر کرنے کے باعث اس کی بھوری داڑھی کے بال سفید ہونے لگے تھے، بتا بھی ادھیڑ عمر کا! ملاحوں کا سا چہرہ سرخ اور خشمگیں نظر آرہا تھا، اس نے چیختے ہوئے کہا، "ہم دو سو سر کاٹیں گے"! اور پھر وہ سر جھکا کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔

درحقیقت یہ شہنشاہ سے اجازت مانگنے نہیں آیا تھا، وہ تو نقشہ عمل بیان کرنے آیا تھا، دو سو ترک سپاہی ابھی چند روز پہلے بندرگاہ کے دہانے پر جو لڑائی لڑی گئی تھی، اس میں گرفتار ہوئے تھے، اب تک زندہ تھے، دوپہر کے وقت یہ دو سو ترک قیدی از راہِ انتقام قتل کر دیئے گئے، اور ان کے سر فصیل کے اوپر جہاں سے غلطہ کا منظر صاف نظر آرہا تھا، ایک چوب بلند پر لٹکا دیے گئے۔

شہنشاہ نے کہا، "لیکن اس طرح ہمارے مقتول زندہ تو نہیں ہو جائیں گے وہ مقتول جو اپنے والدین کے لئے موجب ناز اور اپنے ملک کے لئے باعث فخر تھے۔

شہنشاہ حد درجہ ملول اور افسردہ تھا، مردان شہر پر بھی، انتہائی غم اور صدمے کی کیفیت طاری تھی"!

مدافعین کا جذبۂ دفاع

ترکوں نے نیا پل بنا لیا۔ ایک ہزار ڈرم، رسیوں میں ایک دوسرے سے پیوست کر کے سمندر میں ڈال دیئے گئے، ان کی بالائی سطح صاف اور ہموار کر دی گئی، اور اس طرح پل تیار ہو گیا، پھر ترکوں نے اپنی بڑی بڑی توپیں اس پل سے گزارنا شروع کر دیں، اسی کشتیاں جو خشکی کی طرف سے لائی گئی تھیں، اپنے اپنے نردبانِ بلند کو خالی کرنے میں مشغول ہو گئیں، خشکی کی طرف جو دیوارِ فصیل چھ میل کے علاقے

میں پھیلی ہوئی تھی، بے شک مضبوط و مستحکم تھی، لیکن ترکوں نے اپنی قوت اس طرف مرکوز کر دی اور گولہ باری کر کے اسے خستہ کر دیا۔ اب یونانی مجبور ہو گئے کہ کمزور ترین دیوار کے ساتھ ساتھ اس کی بھی حفاظت کریں۔

آج تک شہر کو ایسا عظیم خطرہ کبھی لاحق نہیں ہوا تھا، اس کے مدافعین مرنے کے لئے تیار تھے، لیکن یہ اپنے شہنشاہ کو ہر حالت میں بچانا چاہتے تھے، ان کی خواہش تھی، قبل اس کے کہ حالات بہت زیادہ نازک ہوں، شہنشاہ شہر چھوڑ دے۔

ایک کشتی تیار کھڑی تھی، کہ شہنشاہ کو لے کر کسی دوسرے ملک میں چلی جائے، صرف ایک گھنٹے کے نوٹس پر یہ روانہ ہو سکتی تھی، اور اگر امید و بیم کا وقفہ طویل ہوا اور شہنشاہ نے قدم باہر نہ نکالا تو پھر آج اس کا بچنا اور سلامت رہنا کسی طرح بھی ممکن نہ ہوگا۔

جب شہنشاہ کے وفادار حامی اور مددگار محل میں حاضر ہوئے، اور صورت احوال اس پر واضح کی اس نے سر کو جنبش دی، وہ جذبات سے اتنا متاثر تھا کہ قوت گویائی مسلب ہو چکی تھی۔

حد یہ کہ جسٹینیانی تک نے شہنشاہ سے التماس کی کہ تقاضائے مصلحت یہی ہے کہ آپ تشریف لے جائیں، باہر جا کر آپ آسانی سے مدد لا سکتے ہیں، اور

کہیں نہیں تو موریا[1] (جنوبی یونان) چلے جایئے،

جسٹینیانی کے سے معتمد سے جو امور دفاع میں اس کا سب سے بڑا شریک کار تھا، یہ الفاظ سن کر شہنشاہ کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔

"اعلیٰ حضرت!" جسٹینیانی نے چلا کر کہا، اور آج پہلی مرتبہ اس سرد و گرم چشیدہ سپاہی کے چہرے پر جذبائیت کے آثار طاری ہوئے تھے، "اس میں قسطنطنیہ کا بھلا ہے!"

لیکن شہنشاہ کسی طرح بھی شہر چھوڑنے پر راضی نہ کیا جا سکا، اس نے کہا، "شہر چھوڑنے کی ترغیب دینے کے بجائے مطالبہ کرو کہ میں تمہارے ساتھ رہوں میں تمہارے ساتھ ہوں اور تمہارے لیے مرنے کو تیار ہوں!"

آج تک کی تاریخ کا سب سے بڑا محاصرہ، اپنی تمام خوں فشانیوں اور ہلاکت آفرینیوں کے ساتھ بہت جلد نقطۂ عروج پر پہنچنے والا تھا۔

۲۶ مئی کو سلطان محمد ثانی نے دوسرا حملہ کیا، مردمانِ قسطنطنیہ سارا دن اذیت اور مصیبت برداشت کرتے رہے، کشتیاں نقل و حرکت کر رہی تھیں، توپیں گولے پھینک رہی تھیں، لیکن حقیقی حملہ غروب آفتاب کے ۴ گھنٹے بعد، پوری شدت اور ہولناکی کے ساتھ شروع ہوا۔ ۳۰ ہزار ترکوں نے کوشش کی کہ

---

[1] Morea

زدبان بلند کے ذریعہ دروازۂ کج کے قریب پہنچ کر اندرون شہر جانے کی راہ پیدا کریں لیکن محصورین نے سختی سے مزاحمت کی اور صبح ہونے سے پہلے دشمن پیچھے ہٹ گیا،

۱۲ مئی کو سلطان محمد نے پچاس ہزار آدمیوں سے حملہ کیا، اس مرتبہ حملہ باب ادرنہ کی طرف سے کیا گیا، بڑھتے ہوئے حملہ آوروں کی آوازیں ہراس اور دہشت پیدا کر رہی تھیں، پس دیوار زندگی کی گھڑیاں گزارنے والے محصورین، سمجھ رہے تھے کہ اب انجام قریب ہے، لیکن اس مرتبہ پھر مدافعین نے دشمن کو غیر معمولی نقصان پہنچا کر پسپائی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔

بہادروں نے سفاکی کا روپ اختیار کر لیا تھا، اچھے لوگ بھی برے بن گئے تھے صورت حال یہ تھی کہ جو یونانی یا اطالوی دیوار سے سر اونچا اٹھاتا گولیوں کا ہدف بن جاتا، اب نوبت دست بدست تن بہ تن جنگ کی آچکی تھی، ایک ترک امیر جو سلطان کا پرچم بردار تھا، ایک یونانی نے حملہ کیا، اس کے ساتھی بھاگ گئے، اور امیر قتل کر دیا گیا۔ ترکان خشمگیں کر جب اپنے ایک سردار کا یہ حال معلوم ہوا تو الٹے پاؤں واپس آئے، اور اس یونانی کو جس نے امیر کو قتل کیا تھا ٹکڑے کر دیے بندرگاہ میں جو عیسائی کشتیاں تھیں، ترک کشتیوں نے انہیں باہر لانے کی کوشش کی، ان کی خواہش یہ تھی کہ سد شناور کو برباد کر دیں، لیکن بحری دیوار کی پشت بلا جود جنسی تھے، انہوں نے یہ خواہش پوری نہ ہونے دی۔

دیوار کو منہدم کرنے کے لئے ہر ممکن ذریعہ اور ہتھیار استعمال کیا گیا، جنگ کے شکوہ ہائے قدیم اور اس زمانے کے جدید طریقے بے محابا عمل میں لائے گئے، منجنیقوں کے ذریعہ بڑے بڑے پتھر پھینکے گئے، گولیوں کے ساتھ ساتھ آتشی سیال بھی استعمال کی گئی، برستی ہوئی گولیاں کبھی کسی انسان کی گردن جدا کر دیتیں کبھی کسی گھوڑے کو موت کے گھاٹ اتار دیتیں۔

ترکوں نے جو نیا ہتھیار اب استعمال کرنا شروع کیا تھا، اس کا توڑ کسی کے پاس نہ تھا۔

یہ ایک برج تھا، یا سینٹ دمانوس کے برجوں کے برابر اونچا۔ یہ متحرک برج آہستہ خرامی کے ساتھ فصیل شہر کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا، اگر مردان قسطنطنیہ کے سامنے عہد جدید کا ایک ٹینک دفعتہً پہنچ جاتا تو بھی وہ اتنے ہراساں اور سراسیمہ نہ ہوتے، جتنے اس متحرک برج کو دیکھ کر تھے۔ جسٹینیانی نے اہل شہر کو فصیل شہر سے پرے ہٹ جانے کا حکم دیا، لیکن دہشت اور شوق تجسس نے ان کے پاؤں پکڑ لیے تھے، وہ مسحور اور افسوں زدہ نظر آ رہے تھے، یہاں تک کہ وہ ہیکل عظیم ——— برج ——— اتنا قریب آ گیا کہ اس کی آتش افروز آنکھیں صاف نظر آنے لگیں، یہ برج محاصرہ تین منزلوں پر مشتمل تھا اور روئے زمین سے فصیل شہر کی طرف پھسلایا جا رہا تھا، ہر منزل میں بڑے بڑے سوراخ تھے، جس سے تیر اور گولے بآسانی باہر کی طرف پھینکے جا سکتے تھے، جب یہ فصیل کے بالکل

پاس پہنچ گیا تو نچلی منزلوں سے لوگ نکل نکل کر باہر آئے، اپنے ساتھ یہ بہت سی لکڑیاں تختے اور درخت کی شاخیں لائے تھے، انہیں خندق میں ڈالنا شروع کر دیا، بار بار اندر جاتے اور یہ سامان لاتے، خندق میں ڈالنے لگتے، برج کی آخری منزل سے ایک زبان فصیل کی طرف پھینکا گیا، اس طرح برج اور فصیل کے مابین ایک پل سا بن گیا، اس پر ترک سپاہی سرخ (فیض) ٹوپیاں پہنے دوڑنے لگے، برج کے ہر سوراخ سے آگ، تیر، تفنگ اور بارود کی بارش ہونے لگی۔

پس منظر میں سلطان محمد سفید دستار سر پہ رکھے، گھوڑے پر سوار اپنے مردانِ جنگی کی حوصلہ افزائی کر رہا، اور دل بڑھا رہا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا، انجام قریب تر آ گیا ہے، بوڑھی عورتوں اور کمسن لڑکوں نے بھاگم بھاگ اپنے اپنے گھروں کا راستہ لیا، اور اپنے بچوں کو اپنے گرد سمیٹ کر جمع کر لیا۔

دن بھر یہ مشینی عفریت فصیل پہ گولے برساتا رہا، اور مردانِ شہر کو دہشت زدہ کرتا رہا، شہنشاہ اور جسٹینیانی دوش بدوش کھڑے یہ منظر دیکھتے رہے، یہاں تک کہ ان کی نظر سینٹ رومانوس کے برج پہ گئی، جو لڑکھڑا رہا تھا، یہ صرف کف افسوس مل کر رہ گئے، کر کچھ نہ سکے، یہ قدیم برج لرزا، جنبش میں آیا اور لہراتا ہوا زمین پہ آ رہا۔

واقعی انجام تھا ——————— لرزہ خیز اور تباہ کن انجام!

لیکن صرف نصف گھنٹے کے اندر مدافعین مصروف عمل ہو گیے، ہر وہ شخص جو دوسری دیوار کو پھوڑ کر آسکتا تھا، بلا لیا گیا اور ان سب نے مل کر راتوں رات ایک مافوق الانسان کارنامہ انجام دے ڈالا، انہوں نے خندق صاف کر ڈالی، برج کو پھر اس کی جگہ کھڑا کر دیا اور پھر یادگار دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ترکوں کے اس چوبی عمارت میں آگ لگا دی، یہ دھڑا دھڑ جلنے لگا اور آن کی آن میں خاکستر کا ڈھیر ہو کر رہ گیا

یہ تھا کارنامۂ یک شبی!

صبح کو سلطان محمد ثانی یہ منظر دیکھ کر بھڑک اٹھا، کل کی ساری خوشی کافور ہو گئی، پاشاؤں اور وزیروں کا یہ حال تھا کہ اس کے سامنے کھڑے لرز رہے تھے۔

لیکن ابھی اس کے پاس ایک اور ہتھیار بھی تھا، یہ ہتھیار اب تک منظر عام پر نہیں لایا گیا تھا، اگر صرف کسی چیز کا عظیم حجم تباہ کن ہو سکتا ہے تو اس نئی توپ کے تباہ کن ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا، جو ہنگری والے اربن نے بنائی تھی، یہی وہ توپ تھی جس کے لئے ادرنہ میں ایک خاص فیکٹری بہ صرف زر کثیر تیار کی گئی تھی، اس کی تیاری میں تین مہینے کی مدت صرف ہو گئی تھی، اور دو مہینے ایک سو پچاس میل کا فاصلہ طے کر کے یہاں تک پہنچنے میں صرف ہو گیے تھے، اس کا وزن تیس ہزار پونڈ تھا، تیس گاڑیوں پر اسے لادا گیا تھا، ڈھائی سو مستری اور کاریگر ساتھ ساتھ چل رہے تھے، تاکہ راستے کو ہموار کرتے رہیں۔ اور درمیان میں آنے والے پلوں کی مرمت اور دیکھ بھال کرتے رہیں، کہ توپ کو کھینچنے والی گاڑیاں کسی حادثے

سے دو چار ہو کر اس کی خرابی کی موجب نہ بنیں ، دو سو آدمی دونوں اطراف میں ساتھ ساتھ چل رہے تھے ، کہ کسی جگہ اگر توپ خم ہو جائے ، یا کسی طرف جھک جائے تو فوراً ٹھیک کر دیں ، اس سلاح سیمگیں نے سامنے آتے ہی ایک چھ سو پونڈ کا گولہ پھینکا ، اس کی مار ایک میل تک جاتی تھی ، دھماکے کی آواز بارہ میل تک پہنچتی تھی ،

اگر برجِ محاصرہ ایک مشینی عفریت تھا ، تو اس توپ کو عہد جدید کے ایٹم بم سے تشبیہ دی جا سکتی تھی ،

لیکن یہ توپ بھی اب تک جنگ سر نہیں کر سکی تھی

یہ توپ جس کا ترک بے چینی سے انتظار کر رہے تھے اور یونانی جس سے حد درجہ خائف اور دہشت زدہ تھے ، کچھ زیادہ کارگر ثابت نہ ہو سکی ، یہ ضرورت سے بہت زیادہ بڑی تھی ، اسے بھرنے میں دو گھنٹے لگتے تھے ، اس کے لئے پانچ سو توپچی درکار تھے ، یہ دن بھر میں صرف سات مرتبہ چلائی جا سکتی تھی ، اور چوتھی مرتبہ جب چلائی گئی تو دھماکے کے ساتھ پھٹ گئی ، ایک ترک مورخ کا بیان ہے کہ " اس دھماکے نے اس کے موجد کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا " لیکن اس جگہ یہ بات بھی غور طلب ہے کہ کہیں خود سلطان نے برہمی کے عالم میں اس کے موجد کو ہلاک تو نہیں کر ڈالا ؟

سلطان محمد ثانی محاصرے کی غیر معمولی طوالت کے سبب آپے سے باہر ہو رہا

تھا، سپاہیوں اور افسروں نے برجِ محاصرہ کا مشورہ دیا، اور اس کی تکمیل میں حصہ لیا تھا، جن خاص خاص لوگوں نے اس عظیم توپ کے بنانے کی صلاح دی، اور مکمل کرنے کا مشورہ دیا، سب معتوب قرار پائے، سب سے سلطان خفا ہو گیا اور انہیں ناملائم الفاظ میں سرزنش کی۔

پھر بھی اب تک ترکی توپیں گھن گرج کے ساتھ خشکی کے حصۂ فصیل پر گولے برسا رہی تھیں، نیز غلطہ سے پل کے رستے مزید توپوں کی آمد کا سلسلہ جاری تھا، فصیل کے ہر طرف توپوں کی گھن گرج نے لوگوں کو بہرا کر دیا تھا، اس ہنگامہ آرائی نے لوگوں کو حواس باختہ کر دیا تھا، عورتیں عالم پریشانی میں رونے اور فریاد کرنے لگی تھیں۔

ترکوں نے ان تجربوں سے سبق حاصل کیا، بڑی توپ اس لئے پھٹ گئی کہ اس کی دھات بہت زیادہ گرم ہو کر پگھل گئی تھی۔ اب ہر دھماکے کے بعد توپ کے دہانے میں روغن ڈال دیا جاتا تھا، جب انہوں نے دیکھا کہ اب گولہ باری سے فصیل کو خاص نقصان نہیں پہنچتا تو انہوں نے برجوں پر دو طرفہ حملے شروع کر دیئے

آخر فصیل کے یہ مختصر سے دستے کب تک جان لڑاتے؟

اپنے کرایے کے سپاہیوں ——— ویسی اور جنوی سپاہی، اور مٹھی بھر یورپین، جو اس کے وفادار تھے، کہ وفاداری کی قیمت پا رہے تھے، جو اس لئے لڑتے تھے کہ لڑنا ان کا پیشہ تھا ——— کو روپیہ دینے کے لیے

شہنشاہ نے خزانۂ کلیسا سے مدد چاہی، یونانی، جو یونانی کلیساء کے رومی کلیسا سے ادغام کے پہلے ہی سے سخت مخالف چلے آرہے تھے پھر بھڑک اٹھے، انہوں نے نعرہ لگایا، "یہ کفر ہے" انہوں نے تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا کہ یہ خزانہ کلیسا کو مسلمانوں کے ہاتھ سے بچانے کے لئے صرف کیا جائے گا

گرانڈ ڈیوک نٹوراس دل سے ان لوگوں کے ساتھ تھا اور ہمیشہ مذہبی اور سیاسی بنیاد پہ ہر مخالف شہنشاہ تحریک میں شریک رہتا تھا، وہ اس موقع پہ جسٹینیانی سے بھڑ گیا۔

جب جسٹینیانی سے نوٹراس نے باب سینٹ رومانوس کے دفاع کے لئے مزید توپوں کا مطالبہ کیا، نٹوراس نے نہایت سختی اور درشتی سے انکار کر دیا۔

"غدار" جسٹینیانی چیخا "کیوں نہ تیری گردن اڑا دوں؟

"کیوں کہ تو ایک بزدل ہے ——"

ادھر یہ دونوں بھڑک اٹھے۔ اُدھر سڑکوں اور چوراہوں پہ وینسی اور جنوی باہم دست و گریباں تھے، آخر خود شہنشاہ کو معاملہ رو براہ کرانے کے لئے موقع واردات پر آنا پڑا، کیا جنگ ان کے لئے کافی نہیں تھی جو یہ آپس میں زور دکھا رہے تھے، اس نے اپیل کی کہ اپنے اختلاف ختم کر دو، متحد ہو کر مشترک دشمن کو زور دکھاؤ، آخر بڑی مشکل سے یہ دونوں پارٹیاں الگ ہوئیں اور امن بحال ہوا۔

اس اثنا میں لڑائی برابر جاری رہی، رات کے وقت فصیل کی مرمت عورتوں اور بوڑھوں، پادریوں، اور ذرا بڑی عمر کے لڑکوں کو سونپ دی جاتی، قبروں کے پتھر اور کتبے تک اکھاڑ اکھاڑ کر فصیل کے روزنوں میں بھرے جانے لگے۔ زخمیوں کی صدائے نالہ نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا، اور شہر پہ مایوسی اور ناامیدی کی کیفیت طاری کر دی تھی۔

بیرونی دیوار میں پھر شگاف پڑ گیا، ترکوں نے خندق بھرنے کی کوشش پھر شروع کر دی، درختوں کے تنے، شاخیں جو کچھ بھی ہاتھ آیا بھرنے لگے اور قبل اس کے کہ اصل کام (جنگ) شروع ہو، اپنے بہت سے سپاہیوں کو انہوں نے موت کے گھاٹ اتار دیا، پاشاؤں کی ایک جماعت کی رہبری میں بہت سے ترک سپاہی، سر کے بل خندقوں میں کودنے لگے، یہاں تک کہ وہ بھر گئی۔ ایک کے اوپر ایک آدمی اندیشۂ موت سے بے پروا موت کے ملنے اور سلطان پر قربان ہونے کے لئے، خندق کو بھرنے کے لئے گرا پڑ رہا تھا، یہ سب لوگ ہنسی خوشی جان سے گزر گئے۔

قسطنطنیہ کا چھ مہینے تک محاصرہ جاری رہا، شب و روز توپیں گولے برساتی رہیں۔ وہ چھوٹی ڈونگی جو سمندر کی لہروں پر رقص کرتی، یورپ سے آنے والے گم کردہ جہازوں کو تلاش کرنے گئی تھی، واپس آگئی، کوئی جہاز اسے نظر نہیں آیا، سارا اسفرا کارت گیا۔ لیکن وہ بہادر سپاہی جو اس کشتی پر

رضا کار کی حیثیت سے گیے تھے، اب رضا کار ہی کی حیثیت سے لڑنے کے لئے آگیے، اور خواہ شہر دشمن سے نہ بچایا جاسکے، خواہ زندگی رہے یا جائے، "ہمارا فرض بازگشت ہے"!

ترکوں کی توپیں پورے زور شور کے ساتھ باب سینٹ رومانوس پہ گولے برسانے لگیں۔

۲۳ مئی کو، چاروں دروازے ڈگمگائے، اور پھر لہراتے ہوئے زمین پہ آرہے"!

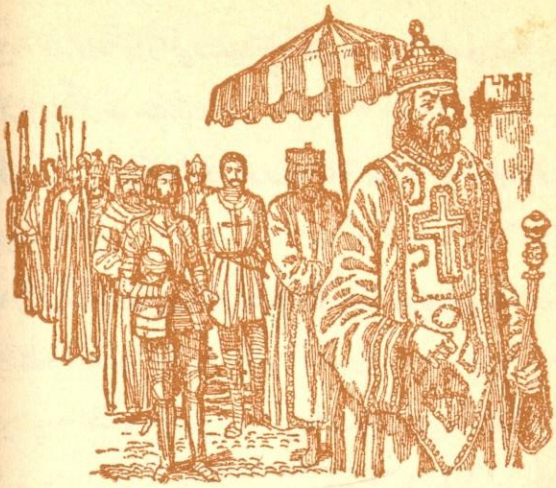

زندگی پر موت کو ترجیح

۲۴ر مئی کو حیرت انگیز طور پر توپیں خاموش تھیں!

سلطان محمد چہار زانو ایک گدے پر بیٹھا ہوا تھا، شمشیر درخشاں کنارے کی طرف زمین پر پڑی ہوئی تھی، مصلیٰ سامنے کی جانب رکھا تھا —— آج پہلا دن تھا کہ سلطان واقعی اپنی فتح مندی پر مسرور اور نازاں تھا، لیکن اس فتح مندی کی بہت گراں قیمت دینی پڑی تھی، ریشمی خیمے کے

پردے اٹھے ہوئے تھے، اور دور تک ینی چری سپاہی سفید ٹوپی زیب سر کیے نظر آرہے تھے، شہر میں داخل ہونے کے لئے ان بہادر سپاہیوں کا چوتھائی حصہ اسے قربان کرنا تھا، ہوسکتا تھا آدھے سپاہی قربان کرنا پڑجائیں، وہ انہیں ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا تھا ——— گنوانے کے لئے نہ کہ ان کی جان گراں مایہ پر افسوس اور صدمے کا اظہار کرنے کے لئے۔

اتنے میں اسے ارزنی چشم شہنشاہ قسطنطین کی شبیہہ نظر آئی جس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی ——— عیسائی جانتے تھے، اب وہ ہرگز فتح یاب نہیں ہوسکتا، لیکن اس نے لڑنے کا تہیہ کرلیا تھا،

کیا واقعی؟

یہ بھی تو ممکن تھا، لڑائی کا خیال اس کے دل سے نکل گیا ہو!

سلطان محمد ثانی کے ابروئے سیاہ پہ شکن پڑگئی، اس نے حقارت کے ساتھ، اور مردانِ جنگی کا یہ شیوہ ہے کہ وہ صلح جو لوگوں کو حقیر نظر سے دیکھتے ہیں، اپنے فیصلے میں اور زیادہ استحکام پیدا کرلیا، وہ فوراً اٹھ بیٹھا، اور اس نے فوری طور پہ دو پاشاؤں کو حاضر ہونے کا حکم دیا

تقریباً دو گھنٹے کے بعد دو شخص دستار زیب سر کیے اور جامۂ فاخرہ میں ملبوس عربی گھوڑوں پہ سوار ترکی لشکر سے سینٹ رومانوس کے پھاٹک کی طرف جاتے نظر آئے، ان کے آگے آگے نقیب تھے، جو قرن بجا رہے تھے، اور ان کے پیچھے

سبز لباس میں ملبوس قاصد دوڑتے ہوئے چل رہے تھے۔

شہنشاہ اور جسٹینیانی ساتھ ساتھ بندرگاہ کی جانب جو دیوار تھی، ادھر کھڑے تھے۔ اتنے میں نکولا آیا، اور مؤدب ہو کر پشت کی جانب کھڑا ہو گیا۔

قسطنطین نے سر کے اشارے سے اسے گفتگو کی اجازت دی۔

"سلطان نے ایک سفیر خدمت عالی میں بھیجا ہے!" نکولا نے کہا، "اور وہ اب اپنے ہمراہیوں کے ساتھ باب قصر پہنچا ہی چاہتا ہے،

شہنشاہ کے چہرے پر ایک ہیجانی تاثر نمایاں ہوا، شاید امید کا، جو معمولاً افسردہ اور سنجیدہ رہا کرتا تھا۔

دونوں شہنشاہ اور جسٹینیانی نے ایک دوسرے کی طرف بیک نظر دیکھا۔ جسٹینیانی تندرست توانا، گلگوں چہرے والا، سخت و درشت شخص تھا، اور شہنشاہ، اپنی خستگی اور درماندہ زیبائی کے لحاظ سے ایک روحانی شخص معلوم ہوتا تھا، صورت حال کو سمجھنے کے لیے دونوں نے گفتگو کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

شہنشاہ نے فوراً گھوڑے کو موڑا، اور قصر بلاچرنی کی طرف روانہ ہوا وہ اب تک سلاح جنگ سے آراستہ تھا، گزشتہ رات اس نے جاگ کر کاٹی تھی، اس لئے تھکا ہوا معلوم ہو رہا تھا، وہ بہت جلد محل میں پہنچ گیا، اور سفیر سلطان کو شرف باریابی عطا فرمایا۔

یہ دیکھ کر اسے بڑی کوفت ہوئی، کہ سلطان کے دو سفیر سامنے موجود تھے لیکن ان میں خلیل پاشا نہیں تھا۔

پہلے سفیر نے گفتگو کا آغاز اس طرح کیا:!

"میرے آقائے ولی نعمت، سلطان
ابن سلطان نے شہنشاہ کی خیریت مزاج
دریافت فرمائی ہے، ان کا ارشاد ہے کہ
کتنا اچھا ہو اگر دونوں فرماں روا ایک
دوسرے سے صلح کر لیں، اور جنگ ختم
کر دیں کہ اب وقت بہت کم رہ گیا ہے!"

سفیر کی نگاہ بلبے کے کئی ڈھیروں پر گئی جو چند روز پہلے تک شاندار اور پرشکوہ برج کی صورت میں کھڑے تھے، پھر اس نے اس ڈھیر کا کچھ حصہ مٹھی میں لیا، اور کہا، "سلطان چاہتے ہیں کہ شہنشاہ ہتھیار ڈال دیں اور شہر کو حوالے کر دیں!"

شرائط جو ہرگز برے نہ تھے، یہ تھے کہ اگر شہنشاہ قسطنطنیہ سے باہر نکل جائے تو سلطان محمد محاصرہ اٹھالے گا، نیز یہ کہ اسے موریہ کی بادشاہت عطا کر دے گا، پھر دونوں میں صلح ہو جائے گی اور دونوں آشتی سے رہیں گے۔ باشندگان شہر کی سلامتی کا پورا پورا خیال رکھا جائے گا، اور جو لوگ شہر چھوڑ کر چلے جانا چاہیں، ان کی پرامن زندگی کا انتظام کر دیا جائے گا۔

لیکن اصل مشکل بدستور موجود تھی۔ گو الفاظ میں یہ بات نہیں کہی گئی، لیکن مطلب صاف ظاہر تھا کہ سلطان محمد ثانی قسطنطنیہ پر قبضہ کر لے گا۔ عیسائیوں کا یہ ایک ہزار سالہ مرکزِ عظیم کافروں (مسلمانوں) کے قبضہ میں چلا جائے گا —— قسطنطنیہ کو مسلمان ہو جانا پڑے گا"!

شہنشاہ نے لباسِ فاخرہ میں ملبوس ان سفراء کو دیکھتے ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ اس کا جواب کیا ہونا چاہئے؟ گو شرائط بظاہر کتنے ہی نرم اور ترغیب دینے والے ہوں، اور گو اس کی جان بخشی کر کے اسے املاک و جاگیر کا کیسا ہی لالچ کیوں نہ دیا جائے، وہ کبھی اور کسی قیمت پر یہ شہر ترکوں کے حوالے نہیں کرے گا۔

سیاست کی دنیا کے کچھ آداب و رسوم بھی ہیں، اور انہیں نظر انداز نہیں کیا جاتا۔ شہنشاہ نے سفیروں کی باتیں بڑی توجہ سے سنیں، اور جب یہ جانے لگے تو اعزاز و اکرام کے ساتھ سرفراز کر کے، جلالِ شاہی کی نمود دکھاتے ہوئے رخصت کر دیا۔

اس کے بعد شہنشاہ نے یونانی، وینسی اور جنوی اشراف و اعیان اور امراء و روساء کو طلب کیا کہ وہ تنہا اپنی ذات پر اس ذبحِ عام کی ذمہ داری نہیں لینا چاہتا تھا جو یقینی تھا، یونانی اور یورپین دونوں اس بات پر متفق تھے کہ سلطان کی پیش کش مسترد کر دی جائے۔ آخر وقت تک جنگ جاری رکھنا چاہئے، ان لوگوں نے اس امر پر بھی اتفاق کا اظہار کیا کہ شہنشاہ کا جواب لے کر فرانزا سلطان کے پاس جائے

جب یہ لوگ چلے گیے، اور شہنشاہ تنہا رہ گیا، تو اس نے حسب عادت مریم عذرا کی تصویر کے سامنے سر جھکایا، امید کی کوئی روشنی نہیں دکھائی دی، لیکن اس کے شرف کا تقاضا یہ تھا کہ وہ ایک شہید کی موت قبول کرلے، اور ننگ و عار گوارا نہ کرے،

جب شہنشاہ کا جواب سلطان کو ملا، تو غصے سے تلملا کر اس نے اپنا پاؤں زمین پر پٹخا، اس وقت وہ فتح قسطنطنیہ کو اپنی ساری رعایا کی زندگی سے کہیں زیادہ گراں مایہ سمجھ رہا تھا"!

خلیل پاشا نے بڑی نرم خوئی اور ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے سلطان کو باتوں باتوں میں اس کے فیصلے سے منحرف کرنے کی کوشش کی، لیکن دوسرے پاشا متفقہ طور پر سلطان کی تائید میں تھے۔

سلطان نے اعلان کیا کہ ۲۹ر مئی کو خدا کے فضل و کرم کے بھروسے پر قسطنطنیہ پر آخری حملہ کر دیا جائے گا" ——————— ہر جانب سے"!

دفعتہً سارے لشکر میں حرکت اور جنبش کے آثار پیدا ہوئے، مہینوں کی فوجی تیاری اور عمر بھر کی تعلیم و تربیت نے ترک سپاہیوں کو میدان جنگ میں پہنچنے کے لیے بیتاب و بے قرار کر دیا تھا۔

۲۷ر مئی کو سلطان نے آخری فرمان صادر کیا، گھوڑوں پر سوار بارہ نقیب برہنہ قرنا ہاتھ میں لیے ہوئے لشکر کے ہر گوشے میں فرمان سلطانی دہرا رہے تھے

اور جنگ کا بگل بجا رہے تھے۔

مسلم دستور کے مطابق ترک سپاہیوں نے پہلے غسل کیا، پھر دو رکعت نماز پڑھی، اور روزہ رکھا کہ نیت اور زیادہ خالص اور عزم مزید استوار ہو جائے۔

پھر جب رات ہوئی تو درویش سامنے آئے، سپاہیوں کے خیمے کے سامنے وہ رقص بے محابا میں مصروف ہو گئے۔ یہ سیاہ لباس پہنے ہوئے تھے، ان کی نوکیلی ٹوپی سب سے نمایاں تھی، پہلے یہ آہستہ آہستہ گردش کرتے رہے، اس کے بعد گردش تیز سے تیز تر ہوتی گئی، یہ ہر ایک کے روبرو، اور ہر خیمے کے سامنے رقص کناں پہنچتے ان کے اونچے دامن ہوا میں لہرا رہے تھے، یہ ان بہادروں کو دائمی زندگی کی نوید دے رہے تھے، جنت کی خوش خبری سنا رہے تھے، کہ خدا کی راہ میں جو مارا گیا وہ سیدھا جنت میں پہنچے گا، جہاں سیاہ چشم اور سحر طراز حوریں ان کے انتظار میں ہوں گی،

سپاہیوں پر وجد اور جذب کی کیفیت طاری ہو گئی، زندگی اور موت ان کی نظر میں یکساں بن گئی، لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ نقش ہو گیا

درویشوں کی روحانی بشارت کے سوا سلطان نے بھاری انعامات کا بھی اعلان کیا، "شہر اور اس کی عمارتیں تو بے شک میری ہیں!" سلطان محمد نے اعلان کیا، "باقی وہاں کے گنجینہ ہائے طلا و جواہر، غنائم اور جو کچھ بھی ہے، سب تمہارا ہے!" جو شخص سب سے پہلے فصیل شہر پر چڑھے گا اسے ترکی حکومت کا سب سے بڑا صوبہ ملے گا، "میری مملکت بہت سے آباد اور خوب زیبا شہروں پر مشتمل

ہے"! سلطان نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا "جو بہادر فصیل قسطنطنیہ پر سب سے پہلے قدم رکھے گا، وہ ترکی مملکت کے سب سے زیادہ خوبصورت اور دولت مند صوبے کا گورنر بنا دیا جائے گا"!

"لیکن ایک غدار"! اس نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے گھن گرج کے ساتھ کہا "اگر وہ پرپرواز بھی پیدا کرلے میرے انتقام و تعزیر سے نہیں بچ سکے گا"!

لشکر میں جو آگ روشن کی گئی، وہ غلطہ سے سمندر کے انتہائی نقطے تک نیم دائرے کی صورت میں دکھائی دینے لگی ——— تخریب و ہلاکت کا رمز!

شہر قسطنطنیہ میں سلطان کا فرمان اتنا ہی معروف و معلوم تھا جتنا خود اس کے لشکر میں،

۲۸ مئی کی صبح کو طلوع آفتاب سے پہلے شہنشاہ حسب معمول گھوڑے پر بیٹھ کر گشت کو نکلا، اور برجوں کے قریب پہنچا، نگہبانوں سے باتیں کرنے اور ان کی حوصلہ افزائی کرنے لگا، اس نازک ترین مرحلے پر اس کا دوست فرانزا آقا کے پہلو بہ پہلو موجود تھا، آسمانِ مشرق کو قبل اس کے کہ سورج کی کرنیں منور کریں، یہ گشت ختم ہو گیا قصر کے قریب دروازہ کیج کے پاس دونوں گھوڑوں سے اتر آئے۔

برج کے محافظوں نے انہیں بتایا کہ ساری رات وہ پشت دیوار سے آوازیں سنتے رہے ہیں، جیسے آہستہ آہستہ کوئی بھاری چیز حرکت کر رہی ہو، اور امر واقعہ یہ تھا کہ ترک نہایت خاموشی کے ساتھ اپنی جنگی مشینوں کو گھسیٹ رہے تھے، یہ ٹھیک خندق کے مقابل تھے، لیکن نگہبان نے کسی آدمی کی آواز نہیں سنی، نہ کوئی نعرہ نہ کسی طرح کا شور، نہ کوئی حکم، کہنا چاہیئے کہ تاریکی شب میں ترک ایک طرح کے خاموش ڈرامے[1] کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

شہنشاہ اور فرانزا بالائے برج پہنچے، لیکن اس طرح کہ نگاہ عام سے پنہاں تھے، پہاڑیوں پر جو جنگی تدبیریں بروئے عمل آ رہی تھیں، ان کا معائنہ پوشیدگی کے ساتھ کرنے لگے، فوجی دستوں اور توپوں کی پیش قدمی اس طرح جاری تھی جیسے بڑا سایہ بڑھتا ہے۔

شہنشاہ کا رخ بلاچرنی واپس پہنچا، جامۂ ارغوانی زیب تن کیا، اور آخری بار اشراف یونانی اور دلاور ترین لاطینی سرداروں کو اپنے حضور طلب کیا، فرانزا دست راست پر ادب سے کھڑا تھا، شہنشاہ نے فرمایا۔

---

[1] PANTOMIME

ایک طرح کا کھیل جس میں بازی گر منہ سے ایک لفظ بولے بغیر صرف حرکات، اشارات اور ایما سے اپنا کام انجام دیتے ہیں۔

"یہ شہر قسطنطنیہ تمام عیسائیوں کا ملجا و ماویٰ ہے، ہر یونانی کے لئے مایۂ فخر اور سرمایۂ ناز، یہ شہر، دنیا کے تمام شہروں کا بادشاہ ہے، جس نے عہدِ ماضی میں روئے زمین کی تمام ملتوں اور قوموں کو مفتوح بنا لیا تھا، اب دشمن اسے تسخیر کرنے کا اٹل فیصلہ کر چکا ہے، کیونکہ اس سے بڑی نعمت اسے اور کیا مل سکتی ہے، لیکن دشمن نادان اور سفاک ہے، یہ غوغا آرائی اور نعرے بازی سے سردارانِ شہر کو ہراساں اور سراسیمہ کر دینا چاہتا ہے۔ لیکن ہم فنونِ جنگ میں مہارت رکھتے ہیں، بہادری ہمارا شعار ہے دلیری ہماری سرشت، ہمیں اپنی نجابت اور قوتِ ارادی پر اعتماد ہے، ہم دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کریں گے'!"

پھر وہ جنوی اور وینسی لوگوں کی طرف متوجہ ہوا اور انہیں جداگانہ طور پر مخاطب کرتا ہوا، پرزور الفاظ میں ان کے گراں بہا خدمات اور کارناموں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے گویا ہوا" ہم انہیں کبھی فراموش نہیں کر سکیں گے'!

گہری خاموشی اور سنجیدگی کے ساتھ سامعین نے شہنشاہ کی باتیں سنیں، لیکن خود شہنشاہ کا یہ حال تھا کہ اس کا دل بجھ چکا تھا، وہ مایوس ہو چکا تھا، پھر بھی اس نے اپنا عزم، اپنی جرأت اور اپنا ولولہ ان لوگوں میں منتقل کرنے کی پوری کوشش کر ڈالی۔ وہ مسلمانوں کی طرح جنت کی بشارت نہیں دے سکتا تھا، کوئی معاوضہ بھی اعزاز کے سوا دینے کی قوت نہیں رکھتا تھا۔ یہ سب ایک عرصے سے اچھی طرح جنگ کر رہے تھے یہ ایک زبردست دشمن کے تابڑ توڑ حملوں کو پامردی کے ساتھ روکتے

رہے تھے ۔ یہ اب تک یہاں موجود تھے ، یہ اب تک شکست سے دوچار نہیں ہوئے تھے ۔

جب شہنشاہ کی تقریر ختم ہوئی تو سب نے ایک دوسرے سے معانقہ کیا ۔ اشراف و اعیان ، اور خود شہنشاہ ، سب سے زیادہ مضبوط قلب رکھنے والے شخص کی آنکھیں بھی اشک آلود ہوگئیں ۔ "ہم دین عیسوی پر اور اپنے ملک پر قربان ہوجائیں گے ۔"

اسی دن سہ پہر کو ایک بڑا جلوس آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ، کلیسائے سانتا صوفیا کی طرف بڑھا ۔ اس کی رہنمائی رومی اور یونانی کلیسا کے سربراہ کر رہے تھے ۔ یہ شہنشاہ کی اپیل کا عملی جواب تھا ، جس نے التجا کی تھی کہ خطرے کا مقابلہ متحد ہو کر کیا جائے ۔ اسقف اور راہب ، اشراف اور معمولی سپاہی سب اس جلوس کے ساتھ تھے ۔ آج کا دن یہ خصوصیت رکھتا تھا کہ ہر طرح کی چشمک اور رقابت ختم ہو چکی تھی پورے اتحاد ، ہم آہنگی اور ہم خیالی کے ساتھ باشندگان قسطنطنیہ کلیسائے سانتا صوفیا میں داخل ہوئے ، یہ بازنطینی حکومت کے جاہ و جلال کا آخری منظر تھا ۔

کلیسائے اعظم حاضرین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا ، صدہا شمعیں روشن تھیں گنبدیں کے فراز سے ان کے سروں پر تصویر مسیح خم تھی ——— شاید آخری بار وہ اپنے امتیوں کو دیکھ رہی تھی ، یہاں اسقف اور راہب اور پادری موجود تھے ۔ عورتیں شمع ہاتھ میں لیے کھڑی تھیں ، سلاح جنگ سے آراستہ سپاہی تھے

جو اپنی ڈیوٹی چھوڑ کر ذرا دیر کے لئے آگیے تھے ——————— یہ سب اس لئے جمع تھے کہ خدا سے دعا کریں کہ شہر دشمن کے ہاتھ میں نہ جانے پائے،

کلیسا کے ہر گوشہ سے سرودِ مذہبی کی آواز آہستہ آہستہ اٹھ رہی تھی، دعا پہلے یونانی میں پھر لاطینی میں مانگی گئی، ہر شخص محراب کلیسا کے پاس پہنچنے کے لیے بیتاب ہو رہا تھا، ہاتھوں کو سینے پہ باندھے کہ نان مقدس کا تبرک حاصل کر لے، جب دعا ختم ہو گئی، کسی کا بھی جی نہیں چاہتا تھا، کلیسا کی مقدس دیواروں کو چھوڑ کر، اور خلوص و محبت کی اس فضا سے الگ ہو کر چلا جائے ——————— آج پہلی مرتبہ کافی عرصے کے بعد قسطنطنیہ کے تمام باشندے متحد تھے۔

شہنشاہ نے ان لوگوں سے جو قریب کھڑے تھے مصافحہ کیا، ان میں مزدور بھی تھے اور امرا بھی، یونانی بھی، اور یورپین بھی، پادری بھی اور سپاہی بھی، پھر وہ تنہا کلیسا سے باہر نکلا، اور باجازت ارغوانی، اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر چلا گیا، ہر افسر اپنے اپنے علاقے میں پہنچ گیا، فصیل کی ہر دیوار، اور ہر دروازے پر الگ الگ پہرے دار، اور نگہبان متعین تھے، گرینڈ ڈیوک آف نوٹاراس نے رہبر کی حیثیت سے ان دیواروں کی کمان سنبھال لی، جو بندرگاہ کی طرف واقع تھیں، گرینڈ ڈیوک نوٹاراس وہ دشمن تھا، جو اب تک کلیسائے مشرق و مغرب کے اتحاد کا، حتیٰ کہ شہنشاہ تک کا مخالف چلا آرہا تھا، اور اب یہی سب سے کمزور مورچے کا، جہاں سے دشمن کی کشتیاں بہت نزدیک تھیں نگہبان مقرر ہوا تھا،

ساری رات ناقوس بجتے رہے اور خطرے کا اعلان کرتے رہے، اور شہر کے ہر مرد، عورت، اور لڑکے کو اس کے مقام ماموریت پر پہنچنے کا اذن دیتے رہے، جو لڑنے کی سکت نہیں رکھتے تھے، انہیں یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ دشمن پر پھینکنے کے لئے پتھر جمع کر کر کے دیوار کے پاس ڈھیر کر دیں، کچھ عورتیں اپنے شوہروں کی حفاظت کے خیال سے لبادے لے آئیں: یہ اپنے شوہروں کا دل بڑھاتیں اور انہیں لڑنے پر ابھارتیں۔

نصف شب کے بعد شہنشاہ اور فرانزا، تمام مورچوں کی تیاری اور استحکام دیکھنے کے لئے آخری گشت پر روانہ ہوئے، کہ صورت احوال کا اچھی طرح سے جائزہ لیں، اور اصحاب کار کی کارگزاری کا معائنہ کر سکیں۔

پھر علی الصباح کہ ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا، شہر کے بڑے میدان میں شہنشاہ نے اپنی افواج کا معائنہ کیا۔ یہ مختصر سی فوج، جو ہر طرح سے تہی مایہ اور کمزور تھی، اندرونی اور بیرونی دیواروں کے درمیان دفاع پر مامور کی گئی۔

اندرونی دیواروں کے بارے میں فیصلہ کیا گیا کہ ان کے دروازے بند کر کے مقفل کر دیے جائیں، تاکہ اب باہر سے کوئی شخص دوبارہ شہر میں داخل نہ ہو سکے جسٹینیانی نے یہ تجویز سپاہیوں کے سامنے پیش کی، انہوں نے رضا کارانہ طور پر اسے قبول کر لیا ——— وہ یہاں اس لیے آئے تھے کہ فتح کریں یا جان دے دیں!!

یہ آخری فوجی مظاہرہ تھا!!

K. P. T. Primary School
No.....
Date.....
WEST WHARF.

فتح میسن

۲۹ مئی کا سورج طلوع ہونے سے بہت پہلے ایک اور دو بجے رات کے درمیان صدائے مہیب شہر کے پورے محیط سے بلند ہوئی، دشت و در ترکوں کے نعرۂ وحشتناک سے گونجنے لگے۔

درویش اور سپاہی پہلے سے دی گئی علامت کے مطابق خیموں کو نذرِ آتش کرنے لگے۔ شعلوں کا دائرہ بحیرہ مارمورا سے بندرگاہ شاخ زریں تک حاوی تھا، ترکوں

نے نعرہ لگایا، "کل ہم قسطنطنیہ میں شب راحت بسر کریں گے۔"

سلطان محمد نے اپنی فوجوں کو حملے کا حکم دیا، انہوں نے برائے فتح قسطنطنیہ خدائے دائم وقائم کی قسم کھائی، اپنے والد سلطان مراد کی قسم کھائی ——— اور اپنی شمشیر خارا شگاف کی قسم کھائی

حملے کا آغاز طبل بلند بانگ، صدائے بوق اور ہزاروں افراد کے دیوانہ وار نعروں سے ہوا، سپاہی شور وغل کرتے خشکی کی ساری دیوار کے ساتھ ساتھ پھیل گیے، جب خندق کے قریب پہنچے تو رک نہ سکے، کیونکہ ایک جم غفیر پیچھے پیچھے آرہا تھا، چنانچہ خندق میں گر پڑے، اور جیسے ہی گرے، دوسرے لوگ جو پیچھے تھے اور اب آگے بڑھ چکے تھے، ان کے اوپر گر پڑے یا ان کے جسم پر سے ہوتے ہوئے آگے بڑھ گیے، یہ حرکت کسی مجنونانہ جوش کا نتیجہ تھی، ہر قدم جو اٹھا تھا، خالص فوجی نقشے اور منصوبے کے ماتحت اٹھایا گیا تھا، ترکوں نے راتوں رات شہر کو ہر طرف سے گھیر لیا، اور خندق کا بڑا حصہ پر کر دیا، ترکی کشتیاں فصیل کے ساتھ پہنچ گئیں، اور سپاہیوں کو نیز اسلحہ اور دیگر سامان جنگ کو ساحل پر اتارنے لگیں۔

حملہ آوروں کا پہلا گروہ رضا کاروں پر مشتمل تھا، یہ لوگ خیمہ نشین اور گلہ بان تھے، ان کے اسلحہ میں صرف دو چیزیں شامل تھیں، تلوار اور نیزہ، یہ صرف انعام اور مال غنیمت کے شوق میں آئے تھے، ان میں کوئی خاص تنظیم و تربیت نہ تھی نہ ان کا کوئی سردار تھا، لیکن اگر ان میں سے کوئی قصد فرار کرتا تو ان کے پیچھے

پاشاؤں کی ایک جماعت کوڑے اور آہنی ڈنڈے لیے خبر لینے کو موجود تھی،

اس ناتراشیدہ گروہ کا یہ کام تھا، جس طرح ہو سکے نردبان کو فصیل تک پہنچا دے، اور دوسرے سپاہی جو پیچھے تھے، تیروں کی بوچھاڑ کر کے ان کے لئے راستہ صاف کر رہے تھے۔

یونانی فصیل پر کھڑے آتش سیال اور کھولتی ابلتی ہوئی رال ان بڑھنے والوں پر پھینک رہے تھے، نردبان پر جو زینے چڑھ چکے تھے، وہ آتش سیال سے جل بھن کر کراہتے ہوئے زمین پر گر پڑے تھے، خندق پورے طور پر ان لوگوں سے جو عالم نزع میں تھے، بھر چکی تھی، سلطان کے نزدیک ان لوگوں کا مرجانا ان کے زندہ رہنے سے زیادہ مفید تھا، یہ لاشیں پل کا کام دے رہی تھیں، جس پر سے حملہ آوروں کی دوسری کھیپ بڑی آسانی سے گزر رہی چلی آ رہی تھی۔

دوسرا حملہ کرائے کے عیسائی سپاہیوں نے مسلمانوں کی طرف سے کیا، یہ مہم جو اور موقع پرست لوگ تھے، لیکن ترک رضاکاروں کی طرح غیر منظم اور غیر مرتب نہ تھے، یہ تربیت یافتہ تھے اور اپنی تنظیم رکھتے تھے، یہ جنگی لائن کے عرض میں پیش قدمی کرتے ہوئے بڑھے، ان کا ہر دستہ ایک ہزار نفر پر مشتمل تھا، پاشاؤں اور وزیروں کی جماعت ان کے پیچھے بھی موجود تھی، اگر ان میں سے کوئی بھاگنے کی کوشش کرتا تو ایک ہی ضرب سے اس کی گردن اڑا دی جاتی۔ جب یہ پیشہ ور عیسائی سپاہی نردبان تک پہنچے، تو ان پر بھی آتش سیال پھینکی گئی، سنگ باری کی گئی، یہ سوختہ جانی

کی حالت میں یا زخمی ہو کر زمین پر آ رہے۔

مدافعین پوری خشونت درندگی اور بربریت کے ساتھ بلا شائبہ رحم لڑ رہے تھے گزشتہ چالیس دن سے انہیں راحت و آرام کی ایک گھڑی بھی میسر نہ آئی تھی، مایوسی کی شدت نے ان میں ہمت اور دلیری پیدا کر دی تھی، شہنشاہ فصیل پر باب سینٹ رومانوس کے قریب موجود تھا، اور جسٹینیانی اپنے سپاہیوں کو بڑھاوا دے کر لڑا رہا تھا، اور خود بھی مصروف پیکار تھا، اور اس جگہ سے جہاں شہنشاہ تھا بہت قریب تھا، ان دونوں کی موجودگی نے یونانیوں اور لاطینیوں میں ایک نئی زندگی اور نیا حوصلہ پیدا کر دیا تھا، یہ دونوں جس جگہ تھے، وہ سخت ترین اور نازک ترین مقام تھا، سلطان محمد ثانی بذات خود اس طرف شدت اور تواتر کے ساتھ حملوں کی ہدایت اور نگرانی کر رہا تھا۔

حملہ آوروں کی تیسری جماعت جس نے فصیل کو نشانہ بنا کر پیش قدمی شروع کی، ینی چری ترکوں پر مشتمل تھی، عبا نہ قد سر پر سرخ ٹوپی ہاتھ میں تیشہ، یہ جنگجو سپاہی خارجی تحریک کے بغیر لڑتے تھے ——————— لالچ انعام یا مال غنیمت کے محتاج نہ تھے، یہ صرف اسلام کے لئے لڑ رہے تھے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ ان کا نعرہ تھا، ان میں سے کسی متنفس کے دل میں فرار کا وہم بھی نہیں گزرتا تھا، بچ جانے یا زندہ رہنے کی کسی خواہش سے یہ بالکل آزاد تھے، لیکن نردبان کے ذریعہ یہ بھی فصیل پر چڑھنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

مٹھی بھر یونانی اب تک حالات کو سنبھالے ہوئے تھے، یہ سینکڑوں اور ہزاروں سروں پر آگ پھینک رہے تھے، پتھر برسا رہے تھے، ابلتی ہوئی اور کھولتی ہوئی رال کی بالٹیاں انڈیل رہے تھے، یہ اپنے تھوڑے سے سامان جنگ کو بڑی کفایت اور احتیاط کے ساتھ استعمال کر رہے تھے،

لیکن ترکوں کی صدائے بوق و طبل برابر جاری تھی، کشتیوں پر سے خشکی کی جانب سے، پل کے اوپر سے ترکی توپ خانہ مسلسل گولہ باری کئے جا رہا تھا، شہر کے مجلہ اطراف پر دھوئیں کے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔

دو گھنٹے تک دفاع کا سلسلہ یونانیوں کی طرف سے جاری رہا، ترک فصیل کے ایک انچ پر بھی قبضہ نہ کر سکے، لیکن اب سینٹ رومانوس کی دیوار کا شگاف اب ایک ہزار فٹ چوڑا ہو چکا تھا۔ جسٹینیانی اپنے دو ہزار رومان جنگی کے ساتھ سخت و شدید حملے کا آغاز کرنے کے لیے تیار کھڑا تھا،

یہ بڑا اہم اور فیصلہ کن مرحلہ تھا، اور سلطان نے اس موقع اپنی پوری قوت صرف کر دی، گرز ہاتھ میں لیے گھوڑے پر سوار ہو کر وہ گشت کر رہا تھا، اس کی دستار سفید اندھیرے میں بھی نظر آ رہی تھی، اب سلطان محمد اپنے بہترین دلاوروں کے ساتھ آگے بڑھا، یہ وہ لوگ تھے جنہیں آج ہی کے لیے محفوظ رکھا تھا،

تازہ دم، مضبوط، دنیا کے بہترین اور تربیت یافتہ جنگجو، یہ رخنۂ دیوار اور خندق پر ٹوٹ پڑے، ان کی کلاہ سفید، امواج دریا کے مانند، بلند اور نمایاں تھیں، اس منظر نے مدافعین کی ہمت شکست کر دی اور انہیں دہشت زدہ کر دیا،

ہو سکتا ہے امر واقعہ یہ ہو کہ "ینی چری" سپاہیوں کی دہشت انگیز شہرت اور خوفناک آمد نے جنگ کا پانسہ پلٹ دیا۔!

لیکن رہی سہی کسر تھی وہ جسٹینیانی کے ہاتھ سے نکل جانے کے باعث پوری ہو گئی، یونانی اب تک "ینی چری" سپاہیوں کی بے پناہ یلغار کو جان پر کھیل کر روک رہے تھے کہ جسٹینیانی کے ایک تیر آکر لگا اور وہ زخمی ہو گیا اور گو وہ درد و اذیت کے باعث خم ہو گیا تھا، پھر بھی گرتا پڑتا شہنشاہ کے پاس کہ فصیل پر موجود تھا، پہنچا، اور غلغلۂ جنگ کے شور میں چلا کر مخاطب ہوا،

"میں چلا!؟"

شہنشاہ کو اس بات کا یقین نہیں آیا، اس نے کہا،

"یہ تو بہت معمولی زخم ہے!"

شہنشاہ کے لئے جسٹینیانی کو کھو دینا ایسا تھا جیسے اس کے دونوں ہاتھ کٹ گئے، جیسے اس کا دل تیر سے چھد گیا۔

لیکن جسٹینیانی نے انکار میں سر ہلایا اور عرض کیا۔

"اعلیٰ حضرت میں آپ سے رخصت ہوتا ہوں!" اس کی آواز لرز رہی تھی،
"کلید مجھے عطا کیجئے کہ شہر واپس جاؤں!"

وہ جس نے سب سے قربانی اور فداکاری کا عہد لیا تھا، ایک معمولی زخم کھا کر خود اپنا عہد سب سے پہلے خود توڑ بیٹھا ——— جسٹینیانی ہاتھ سے نکل گیا، اب فوجوں کی کمان نہیں کرے گا!

شہنشاہ نے انتہائی نارضامندی سے دروازۂ شہر کھول دیا، سپاہیوں نے اپنے سالار اور کمانڈروں کو جو غائب پایا تو ان کا حوصلہ بھی جواب دے گیا ان کے چہرے پسینے سے تر تھے، اور قریب پڑے ہوئے پتھر اس خون سے سرخ ہو گئے تھے، جو ان کے زخموں سے بہہ رہا تھا، یہ تین گھنٹے سے بے جگری سے لڑے جا رہے تھے۔

چونکہ جسٹینیانی ایک جنوی تھا، اور جنوی اپنی بے وفائی اور ناقابل اعتماد ہونے میں مشہور رہے تھے، بعض مورخین نے تند و تلخ الفاظ میں اس پر نکتہ چینی کی اور ملامت کی ہے، لیکن بعض دوسرے مورخوں نے اس کی طرف سے مدافعت کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس نے اپنی زخم کی سنگینی اور شدت کو محسوس کر لینے کی وجہ سے ایسا کیا۔

جسٹینیانی اس شہر میں جہاں چار مہینے سے دشمن کو شکست دینے اور خون ریز لڑائی کے نقشے تیار کر رہا تھا، اب وہ ایک تنگ کوچے سے جو سمندر

تک جاتا تھا، گزرتا ہوا، اس جگہ پہنچ گیا، جہاں اس کا جہاز لنگر انداز تھا، اور پھر جنوا روانہ ہوا، لیکن وطن کی سرزمین کا دیکھنا قسمت میں نہ تھا، چھ روز بعد اپنے جہاز میں مر گیا۔

لیکن شہنشاہ ان باتوں سے لاعلم تھا، اس کے لیے اپنے ایک رفیق کار اور رفیق پیکار کی غداری اور جدائی ایک دل دوز سانحہ تھا، آخری مرتبہ اس نے جب اسے دیکھا تو اس حال میں کہ جسٹینیانی کی پشت اس کی طرف تھی، اور وہ ایک شہر ویران کی طرف بڑھ رہا تھا،

بہت سے جنوی سپاہیوں نے جسٹینیانی کی تقلید کی، جسٹینیانی کے لیے دروازہ کھولنا، دوسروں کی ترغیب کا سبب بن گیا، موت کے پنجے سے بچنے کی اس سے اچھی صورت اور کیا تھی؟

یورپین سپاہیوں اور دلاوروں کی پیمان شکنی اور بدعہدی نے دفاع کا سارا نظام درہم برہم کر دیا، خاص طور پر باب سینٹ رومانوس پر، ترکوں کی تعداد یونانیوں سے کہیں زیادہ تھی، ان کی توپیں مسلسل گولے اگل رہی تھیں، یعنی چری سمندری لہروں کی طرح بڑھے چلے آرہے تھے، پوری بے رحمی اور شقاوت کے ساتھ تابڑ توڑ حملوں کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک دیوار عظیم جو ایک ہزار سال سے بڑے بڑے حملوں اور یورشوں کو روکتی چلی آرہی تھی، لرز کر گر پڑی، اور خاک کا ڈھیر ہو گئی۔

لیکن اب بھی حال یہ تھا کہ ہر وہ عیسائی جو زندہ بچ گیا تھا، فضا میں لہراتی ہوئی تلوار ہاتھ میں لئے دشمن کا سینہ چھید ڈالنے کے لئے بیقرار تھا ——— جنگ اب تک ختم نہیں ہوئی تھی،

اور ٹھیک اس موقع پر ایک صدائے وحشت ناک اندرون شہر سے گونجی،

"شہر چھن گیا!"

جو بہادر سینٹ رومانوس پر داد شجاعت دے رہے تھے، وہ ٹھہر گئے، منہدم دیوار کے سامنے وہ دیکھ رہے تھے کہ دروازہ کرکوپورٹا[1] اور اس کے برج بلند پر ترکوں کا سرخ پرچم لہرا رہا تھا،

"شہر ہاتھ سے گیا!"

اس صدائے دردناک سے محصور شہر کے بام و در گونجنے لگے۔

شہنشاہ گھوڑا دوڑاتا کرکوپورٹا پہنچا، اسے یقین تھا یہ خبر غلط ہے، بے شک کچھ ترک داخل شہر ہو گئے تھے۔ لیکن انہیں یونانی سپاہیوں نے ہلاک بھی کر دیا تھا ترک فدائیوں کا ایک دستہ پہنچا جو اس لیے بھیجا گیا تھا کہ یونانی پرچم پھاڑ ڈالے، اور شہنشاہ مارک کے دینسی علم کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے، اور اس کی بجائے ترکی جھنڈا لہرا دے، یہ ترک فدائیوں کا دستہ کس طرح پہنچ گیا، اس افراتفری کے

---

[1] KERKOPORTA

عالم میں کوئی نہ معلوم کر سکا، لیکن جب شہنشاہ یہ نفس نفیس دروازے پر پہنچا تو مختصر لیکن ہولناک جنگ ختم ہو چکی تھی، اور چند لمحوں کے اندر سرخ جھنڈا پھر سرنگوں تھا، لیکن بدقسمتی سے جو دستۂ فوج اتنی مدت سے بہادری کے ساتھ لڑ رہا تھا، دفعتہً حوصلہ ہار گیا، دشمن کا جھنڈا لہراتے دیکھ کر وہ دہشت زدہ ہو گیا، سپاہیوں نے ہتھیار پھینک دیے، اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنے لگے، ساری بہادری اور دلیری کافور ہو چکی تھی۔ یہ بہادر سپاہی شہریان قسطنطنیہ کے دوش بدوش بھاگ رہے تھے۔

بے شک سب نہیں بھاگے، خود شہنشاہ نے گھوڑے سے اتر کر تلوار و سپر سنبھالی، اب وہ خود کمان کر رہا تھا، یونانی اس کے گرد ہو کر لڑنے لگے، فرانز بھی بھی موجود تھا، اگرچہ وہ اتنا بوڑھا تھا کہ لڑنا اس کے لئے ناممکن تھا۔

سلطان محمد نے یہ بھگدڑ دیکھ کر حملہ اور زیادہ شدید کر دیا، اس کا اسپ سفید فوج کے عقب میں نمایاں طور پر نظر آ رہا تھا، اس کی دستار بلند بھی ——— اور اس کا تیغہ بھی،

فصیل کی دیواریں اب مٹی کا ڈھیر تھیں، اس ڈھیر پر سے ہو کر ترک سپاہی آگے بڑھنے لگے،

وہ ایک دیو پیکر ینی چری تھا جو سب سے پہلے فصیل پر چڑھا، اس کا نام حسن تھا، مضبوط تن و توش اور گٹھے ہوئے کا آدمی تھا، پھر اس کے تیس ینی چری ساتھی بھی

فصیل پر چڑھ گیے، جن میں سے اٹھارہ اسی وقت قتل کر دیے گیے، حسن دیوار پر چڑھا اور کھڑا ہو گیا، تاکہ دوسرے لوگ اسے دیکھ لیں، لیکن جلد ہی مدافعین نے اسے دیوار سے نیچے دھکیل دیا، وہ زخمی ہو گیا، لیکن برابر لڑتا رہا، پھر ہمت کر کے اٹھا مگر سنگ باری نے پھر گرا دیا، ——————— بہر حال وہ پہلا آدمی تھا جو دیوار پر چڑھنے میں کامیاب ہوا، اس کارنامے کی بناء پر وہ سلطان کے سب سے زیادہ زرخیز اور شاداب اور دولت مند صوبے کا گورنر بننے کا مستحق تھا، لیکن زخموں نے اسے جانبر نہ ہونے دیا اس انعام سے وہ فائدہ نہ اٹھا سکا۔

حسن نے بہر حال یہ ثابت کر دیا کہ ناممکن کو ممکن بنایا جا سکتا ہے، سلطان محمد نے اس کی بدولت اپنے منصوبے کو جامۂ عمل پہنایا، اب سینکڑوں ترک اس دیوار پر اور برج پر جا چڑھے کہ اب یونانیوں کے لئے ان کا روکنا ناممکن ہو گیا، مدافعین دیوار کے درمیانی حصے کے اندر محصور ہو کر گویا اسیر دام ہو گیے تھے۔ ایسی چھوٹی سی اور محدود جگہ میں لوگ ایک دوسرے پر گر پڑتے تھے، تلواریں ٹکرا رہی تھیں، سپریں متصادم ہو رہی تھیں۔

لڑائی کے عین وسط میں قسطنطین بھی دادِ شجاعت دے رہا تھا۔ لوگ اسے گھیرے میں لیے ہوئے تھے۔ ان میں بہت سے یا تو مار ڈالے گیے یا پیچھے دھکیل دیئے گیے فرانزا نے شہنشاہ کے جو آخری الفاظ سنے، وہ یہ تھے،

"کوئی مسیحی کیا مجھے قتل نہیں کر سکتا؟"

یہ الفاظ کہہ کر یہ پانچ بنی چری سپاہیوں پر ٹوٹ پڑا، تین بنی چری اس نے ہلاک کر دیئے۔ اور باقی دو نے تلوار اس کی کمر میں پیوست کر کے اسے ہلاک کر دیا، لیکن درحقیقت واقعہ کیا ہے یہ کسی کو نہیں معلوم۔ بہرحال قسطنطین فرانزا کی نظر سے اوجھل ہو گیا، اور اس کی لاش لاشوں کے انبار میں دب گئی۔

شہنشاہ کی ہلاکت کے بعد مزاحمت کا وجود ہی باقی نہ رہا، فاتح ترک سپاہی شگاف ہائے سینٹ رومانوس میں سے ہوتے ہوئے داخل شہر ہو گیے اور وہ سپاہی ان سے آملے جو بندرگاہ کی طرف سے داخل شہر ہوئے تھے۔

جیسے ہی سورج طلوع ہوا۔ سلطان محمد نے دیکھا کہ اس نے گوہر مقصود پا لیا۔

۵۳ دن کے محاصرے کے بعد قسطنطنیہ ——————— وہ مستحکم اور باشکوہ قلعہ، جس نے ایرانیوں، رومنوں، اوارقل، بلغاریوں اور خلفاء کے سیل رواں کو اپنی فصیل کے اندر نہیں آنے دیا تھا ——————— سلطان محمد ثانی کی فوج قاہرہ سے شکست کھا گیا،

۲۹ مئی ۱۴۵۳ء کی سہ پہر کو سلطان محمد ——————— جو اسی وقت سے سلطان محمد فاتح کے نام سے ملقب ہو گیا ——————— باب ادرنہ سے فاتحانہ شان و شکوہ کے ساتھ داخل شہر ہوا، وہ اپنے اسپ سفید پر سوار آہستہ آہستہ سانتا صوفیہ کی طرف

THE AVAR لے

بڑھ رہا تھا، صدائے فرناد صدائے جرس بند ہو گئی،
نقارہ فتح پر چوٹ پڑ رہی تھی!

فاتح، غدار اور شہید وطن

قسطنطنیہ کی فصیل تلے آخری رومن شہنشاہ کی قسمت اور زندگی کا فیصلہ ہو گیا، باب سینٹ رومانوس کے بالکل قریب قسطنطین پیلیولاگس، قسطنطین اعظم کا جانشین، ایک بہادر کی موت مر گیا۔

جنگ ختم ہونے کے بعد قرمزی رنگ کے کفش شاہی، جن پر سنہرے عقاب کا نشان خسروی زردوزی سے کڑھا ہوا تھا، لاشوں کے ڈھیر سے برآمد ہوئے، کوئی

بھی نہ بتا سکا ، اس ڈھیر میں شہنشاہ کی لاش کون سی تھی ؟ لیکن ینی چری حسب ارشاد سلطانی ایک لاش لائے ، جو جامۂ شاہی میں ملبوس تھی ، لیکن اتنی بگڑ چکی تھی کہ شہنشاہ کے قریب ترین دوست بھی اسے پہچاننے سے قاصر تھے ، نعش کا سر کاٹ لیا گیا ، اس کا سر گھاس سے بھر دیا گیا ، پھر اسے جسٹینیانی کے مجسمے پر آویزاں کر دیا گیا ، تاکہ خلق دیکھے اور عبرت حاصل کرے ،

باب سینٹ رومانوس ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا گیا ، دوسرے پھاٹکوں اور دیواروں کے برعکس اس کی مرمت تک نہ کی گئی ،

کیا سلطان محمد نے اس حالت میں اس لیے اسے چھوڑ دیا کہ اپنی فتح عظیم کے آثار کے طور پر اسے یوں ہی باقی رکھے ؟ یا اس لئے چھوڑ دیا گیا کہ آنے والی نسلیں جب ادھر سے گذریں تو فدائیان وطن کے استقلال و عزیمت کی داستان خود بخود دل و دماغ پہ نقش ہو جائے ؟

سلطان اپنی فوج کے ساتھ شہر میں داخل نہیں ہوا ینی چری زرہ بان کے ذریعہ فصیل پر چڑھے ، اور کافی نقصانات اٹھانے کے بعد داخل شہر ہوئے ، بندرگاہ کی طرف سے ایک اور بڑی سی ترکی فوج آگئی ، اور ینی چری سے مل گئی ، ان دونوں بازوؤں کے پیچھے پوری فوج موجود تھی ، جو تیغ بدست نعرے لگاتی شہر میں داخل ہوئی تھی لیکن سلطان محمد فاتح نے اپنا وعدہ پورا کیا ، دور کھڑا رہا ، اس نے اپنے سپاہیوں سے قبل از فتح وعدہ کیا تھا کہ " جو لوگ شہر فتح کریں گے ، وہی یہاں

کے مال و دولت اور افراد کے مالک ہوں گے "

اور افراد شہر کس حال میں تھے ؟

جب ترکوں کا سرخ جھنڈا — باب کرکوپورتا پر لہرایا ———— جو درحقیقت ایک مغالطہ انگیز اعلان ترکوں کی فتح کا تھا ———— تمام لوگ مرد، عورتیں، بچے، مائیں بچوں کو گود میں لیے ہوئے، بچے ماؤں کے دامن سے لپٹے ہوئے، ہمت اور استقامت نابود ہو چکی تھی، سب بلا امتیاز و تفریق کلیسائے سانتا صوفیا میں جمع تھے، دہشت زدہ اور سراسیمہ، انہوں نے دروازوں کو بند کر دیا تھا، ان کا شہنشاہ ان کے لئے لڑ رہا تھا، اور جان دے رہا تھا، یہ اس مقدس پناہ گاہ میں دم سادھے بیٹھے ہوئے تھے۔

یہ گڑگڑا گڑگڑا کر دعا مانگ رہے تھے، فرشتوں کی آواز پر، سننے کے لیے کان لگائے تھے، انہیں اب تک خبر نہ تھی، کہ ان کا شہر مفتوح ہو گیا، ان کی آنکھیں اب تک اس فرشتے کو ڈھونڈ رہی تھیں، جس کے نزول کا پادریوں نے وعدہ کیا تھا، یہی فرشتہ تو تھا جو آسمان سے اتر کر دشمن کی پیش قدمی کو روک دینے والا تھا۔

جب انہوں نے دروازہ کلیسا پر دستک کی آواز سنی، تو ان میں سے بعض اب تک پر امید تھے، ———— لیکن نہیں، یہ دستک فرشتے کی نہ تھی، یہ دشمن کے کلہاڑوں کی آواز تھی، جو دروازوں کو توڑ رہا تھا،

دروازہ ٹوٹا اور ترک سپاہی بہ خط مستقیم اس مجمع ناپرساں کی طرف لپکے، اجنبی زبان میں ان کے شور و غل کی آواز نے فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا، اور یہ مجمع ہکا بکا رہ گیا۔

ترکوں نے ان اسیروں میں سے انتخاب شروع کر دیا، انہوں نے نظم و ترتیب کے ساتھ یونانیوں کو کلیسا سے باہر نکلنے پہ مجبور کیا، پھر امیروں، اور غریبوں کو جدا جدا صفوں میں کھڑا کر دیا، ان لوگوں میں ہر طرح کے اصحاب تھے قانون دان، قانون ساز، غلام، خادم ان سب کو ایک رسّی میں باندھ کر ایک طرف کر دیا، پھر عورتوں کی باری آئی، انہیں انہی کی چادروں سے باندھ لیا اور اس طرح ان سب کو ایک لمبی قطار کی صورت میں کلیسا سے باہر لائے،

شہر کے وہ لوگ، جو کلیسا میں نہیں تھے، اور گرفتاری سے بچ گئے تھے، سر پر پاؤں رکھ کر بھاگتے، گلیوں کو پھلانگتے، دامن کوہ سے ہوتے، سیدھے بندرگاہ پہنچے، یہاں جنوی اور وینسی ملاح کشتیاں لیے کھڑے تھے، گودی کا سارا علاقہ ان دہشت زدہ اور سراپا اضطراب لوگوں سے ہٹا پڑا تھا، بہت سے لوگ تو بے تحاشا سمندر میں کود پڑے، اور تیرتے ہوئے ایک کشتی سے دوسری کشتی میں پناہ لینے کے لیے پہنچتے رہے، لیکن ملاحوں نے انہیں بٹھانے سے انکار کر دیا وہ اپنے ہم وطنوں کو ترجیح دیتے تھے، حد یہ ہے کہ غلطہ کے جنوی بڑی تعداد میں بھاگ کھڑے ہوئے، اگرچہ سلطان نے وعدہ کیا تھا کہ کسی طرح کا گزند انہیں

ہرگز نہیں پہنچنے پائے گا۔

دنیا کا سب سے بڑا شہر کہ ایک زمانے میں اپنی ثروت عظمت، اور قدامت کے لحاظ سے سرتاج دیار وانصار مانا جاتا تھا، آج مفتوح تھا، عثمانی ترک اس پر قابض تھے، ایشیا کے میدانوں سے جو یلغار دو سو برس سے جاری تھی وہ آج انجام کو پہنچ گئی، مسلمان مجاہد، کرائے کے عیسائی، اناطولیہ کے گلے بان، ریوڑ چرانے والے، کسان اور کاشتکار جو لشکر کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے، قسطنطنیہ کے ذخائر اور گنجینے اب ان کے تصرف میں تھے۔ بظاہر قسطنطنیہ مفلس اور مفلوک تھا، لیکن، دفینے، گراں بہا، خیرہ کن دفینے قدم قدم پر موجود تھے، شہر کے بہت سے اشراف واعیان نے اپنے قیمتی اور فاخرہ ملبوسات، پارچہ جات، زیورات، جواہرات، ریشم و کمخواب اور سکہ ہائے سیم و زر، زیر زمین چھپا رکھے تھے، انہوں نے سونے اور چاندی کے نئے اور پرانے سکے زمین کے سینے میں دفن کر دیئے، لیکن، دفاع ملک کے لئے اپنے شہنشاہ کی خدمت میں پیش نہ کر سکے، یہ سرمایہ ان کی ضرورت سے فاضل اور شہنشاہ کے لئے ہمت آفریں تھا، ان میں سے بعض نے ان چھپائے ہوئے خزانوں کا موت سے اپنی جان خرید لینے کی امید میں خود ہی ترکوں کو بتا دیا، ترک سپاہیوں کو ہنوز کلیسا اور صومعہ کے اندر گنجینہ ہائے زر، مروارید سے بھرے ہوئے ظروف، گلدان طلا و نقرہ، سونے کے بخور دان، قیمتی ملبوسات اور متقدس زیورات جو کلیسا

سے متعلق تھے، ملتے چلے جا رہے تھے۔

مگر یہ تاراج گری ویسی نہ تھی جیسی چوتھی صلیبی جنگ کے یورپین مجاہدین نے قسطنطنیہ میں اس سے پہلے مچائی تھی، بازنطینی کتب خانوں سے ایک لاکھ بیس ہزار کتابیں غائب ہوگئیں، ترکوں کی نگاہ میں یونانی کتابوں کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی ان کتابوں کے بدلے میں انہیں ایک ڈوکٹ[1] ملتا تھا، خواہ ان کتابوں میں ہومر یا ارسطو کی کتاب کیوں نہ ہو، خوش قسمتی سے وینسی اور جنوی توپ و تفنگ کی آتش ریزیوں میں بھی کاروبار سے غافل نہ تھے، چنانچہ ان گراں بہا کتابوں کا بڑا ذخیرہ سستے داموں قسطنطنیہ سے اٹلی پہنچ گیا، ان چوری کی ہوئی اور لوٹی ہوئی کتابوں کے باعث یورپ یونان کی دانش کہن سے واقف ہوا، یہ کتابیں عام طور سے پھیلیں اور تجدید و تعمیر کا سبب بنیں۔

سات گھنٹے تک ترک غوغا آشوب اور تاراج گری میں مشغول رہے، نہ کوئی آرٹ کا نمونہ محفوظ تھا، نہ کوئی عورت[2]، ان سے جس انعام کا وعدہ کیا گیا تھا، وہ تھا ——— مال غنیمت اور اسیرانِ جنگ۔

سہ پہر کو سلطان محمد فاتح حاکمانہ شان سے داخل شہر ہوا، تمام جنگ، خون ریزی

---

[1] DUCAT ایک سکہ جس کا یورپ میں پہلے رواج تھا۔

[2] تتمہ میں اس موضوع پر میں نے بحث کی ہے (مترجم)

اور تاراج گری، کہ ۲۹ مئی کو طلوع آفتاب سے پہلے شروع ہوئی، اب وہ تاریخ کا حصہ بن چکی ہے، سلطان محمد اپنے اسپ سفید پر سوار خراماں خراماں باب ادرنہ سے داخل شہر ہوا، یہ دروازہ اس دن سے فاتحوں کا دروازہ بن گیا، بعد کی صدیوں میں سلاطین جب بھی فتوحات سے واپس آئے، باب ادرنہ سے قسطنطنیہ میں داخل ہوئے۔

سلطان کے ساتھ اس کا حفاظتی دستہ تھا جو وزیروں اور پاشاؤں پر مشتمل تھا یہ وہ لوگ تھے جو اپنی خوش روی، زور بازو اور بلندی قامت کے لحاظ سے ممتاز تھے "ہرکیولس" کے مانند قوی بازو، اپولو کی طرح چابک دست، ان میں سے ہر ایک جنگ کے میدان میں دس سورماؤں پر بھاری!

ان ترکوں کی بہت بڑی تعداد نے قسطنطنیہ کو پہلی بار اندرون فصیل میں داخل ہو کر دیکھا تھا، یہ گھوڑے کی زین پر پیدائشی سواروں کی شان سے بیٹھے تھے، اپنے سر و دستار کو کبھی ادھر کبھی ادھر اس طرح حرکت دیتے تھے جیسے اس عظیم شہر کی عظمت نے انہیں ذرا بھی مرعوب و متاثر نہیں کیا ہے، لیکن ان کی چشم سیاہ شہر کے قصور و محلات اور کلیسا کے باشکوہ گنبد دیکھ کر چمک اٹھی۔

سلطان بڑے میدان میں آکر رک گیا، یہ میدان قتل گاہ تھا، آج سے نہیں اس

لہ رومی اور یونانی دیوتا جو مردانہ حسن اور جسمانی طاقت کا نمونہ سمجھا جاتا ہے۔ (مترجم)

ے یونانی مذہب میں روشنی، موسیقی، شاعری وغیرہ کا دیوتا (مترجم)

وقت سے جب سے یورپین مجاہدین صلیب نے ۱۲۰۴ء میں اسے پہلے پہل قتل گاہ بنایا تھا۔ لیکن وسط میں اب تک کچھ چیزیں بدستور موجود تھیں، جو عہد ماضی کی یاد دلا رہی تھیں خاص طور پر ستون مار ہائے پیچیدہ، اب سلطان کے مضبوط بازوؤں میں غیر معمولی قوت آگئی تھی، اس نے اپنے عصائے آہنی سے ایک ضرب لگائی اور اسے پارہ پارہ کر دیا۔

کلیسائے سانتا صوفیا میں وہ گھوڑے سے اتر پڑا جو یونانی حالت اضطراب میں یہاں جمع ہوئے تھے، وہ ہٹائے جا چکے تھے، صرف اس کے اپنے آدمی موجود تھے "مال غنیمت بھی تمہارا، اور باشندگان شہر بھی تمہارے!" سلطان نے اپنے آدمیوں کو مخاطب کر کے کہا، "البتہ شہر اور اس کی عمارتیں میری ہیں!"

وزیروں، پاشاؤں اور موکب سلطانی کا گروہ، سلطان کے بعد داخل کلیسا ہوا، کلیسائے سانتا صوفیا کو فوراً ہی مسجد بنا لیا گیا، جس دن سلطان فاتحانہ شان سے شہر میں داخل ہوا مؤذن نے اسی وقت دنیائے عیسائیت کے سب سے بڑے کلیسا نے بلند کے فراز سے اذان دی، اور لوگوں کو اس نئی مسجد میں نماز کا بلاوا دیا، سانتا صوفیا کو مسجد بنانے کے بعد سلطان قصر بلاچرنی میں آیا، یہاں کے خالی کمرں کو دیکھ کر وہ زیر لب مسکرائے بغیر نہ رہ سکا، پھر گویا ہوا "مکڑی نے قصر شاہی میں جالا بنا، اور بوم نے افراسیاب کے گنبد پر شور مچایا!"

سلطان محمد فاتح اچھا عالم اور دانش ور تھا، اس نے درحقیقت فارسی کا ایک شعر

پڑھا تھا[1] لیکن اب تک اس کی رگوں میں جو خون گردش کر رہا تھا، وہ بیشیا کے صحرا گردی کا تھا۔

اب اس نے گریٹ ڈیوک آف نوٹاراس کو طلب کیا، جب اس بات کی سرکاری طور پر تصدیق ہوگئی کہ شہنشاہ میدانِ جنگ میں ہلاک ہوگیا، تو اب اپنے مرتبے اور منصب کے لحاظ سے جو کچھ تھا، ڈیوک ہی تھا۔

نوٹاراس، فاتح کے حضور میں اپنے ذاتی خزانے کے کچھ تحائف لے کر حاضر ہوا، اپنے خزانے سے جو اس نے چھپا رکھا تھا، آج اس سے کام لینے کا وقت آگیا تھا، اس کے پیچھے غلام تحائف اور ہدایا سر پر رکھے لا رہے تھے، ظروف سیمیں، تاج جواہر نشان اور جامہ ہائے بلوریں خاص طور پر مرکزِ نگاہ تھے۔

ڈیوک نئے تاجدار کے سامنے جھک گیا، جو اطمینان سے ایک گدے پر وقار سے نشست فرما تھا۔ قصرِ شاہی کے اس کمرے میں فرنیچر کے نام سے بس یہی ایک چیز تھی، سلطان کئی زبانوں کا ماہر تھا، اس نے یونانی زبان میں ڈیوک سے کہا۔

---

[1] غالباً یہ شعر پڑھا ہوگا،

بر دہ داری می کند بر قصرِ عنکبوت
بوم نوبت می زند بر گنبدِ افراسیاب

(مترجم)

"اس خزانے کو تم نے اپنے شہنشاہ اور ملک کے دفاع پر کیوں نہ صرف کیا؟"

"خدا نے اسے اعلیٰ حضرت کے لئے مخصوص رکھا تھا!" ——— ڈیوک نے نیاز مندی اور فروتنی کے ساتھ جواب دیا،

"اگر خدا نے اسے میرے لئے محفوظ رکھا تھا، تو تم نے اتنی طویل خون ریز اور تلخ جنگ کیوں گوارا کر لی؟" سلطان نے فرمایا،

جواب میں ڈیوک نے کہا، "میں فرستادگان سلطان پر اعتماد نہیں کرتا تھا، اور غداری کی شہادت خود اعلیٰ حضرت کا ایک معزز وزیر دے سکتا ہے،"

خلیل پاشا سلطان کے پس پشت بت بنا کھڑا تھا،

یہ ملاقات تلخی کے ساتھ ختم ہوئی، جب ڈیوک جانے لگا، اس کی رفتار سے بے اعتمادی نمایاں تھی، کوئی کام کی بات نہیں ہوئی تھی، بجز اس کے کہ ڈیوک کے خادم جب آئے تھے تو ان کے ہاتھ تحائف و ہدایا سے بھرے ہوئے تھے، اور جب گیے تو خالی ہاتھ تھے، البتہ اس ملاقات کا ایک نتیجہ ضرور نکلا، یعنی ڈیوک کے جانے کے بعد سلطان کی طرف سے عفو عمومی کا فرمان صادر ہو گیا، سلطان نے پیکر حلم و عفو بن کر شہر کا ایک گشت کیا، اس کا اسپ سفید تک وفور مسرت سے رقص کے عالم میں تھا، اس کے خفتان کے جواہر جھلملا رہے تھے، اس کی دستار سفید آفتاب کی روشنی میں بجلی کی طرح چمک رہی تھی، اس نے ان عورتوں کو تسلی دی جن کے شوہر جنگی قیدی بنا لیے گیے تھے۔ اس نے اپنے وزراء سے کہا کہ یونانی اشراف و اعیان

کی فہرست جلد از جلد مہیا کی جائے۔

طویل خاموشی کے بعد خلیل پاشا نے ڈرتے ڈرتے کہا، "ان کی بڑی تعداد اپنے آقا کے ساتھ جان دے چکی ہے۔"

سلطان نے سرد مہری کے ساتھ فرمایا، "مجھے ان لوگوں کی فہرست چاہیئے جو زندہ ہیں۔"

شہر کے اشراف و اعیان نے مشتاقانہ طور پر اس فہرست میں اپنے اور اپنے اہل خاندان کے نام درج کرائے، جو حضور سلطانی میں پیش ہونے والی تھی، یہ سب کل نو خاندان تھے، ان میں سے ہر ایک رقیبانہ کشمکش اور کشائش کے ساتھ ہدایا و تحائف خدمت سلطانی میں پیش کرنے کے لیے بیتاب تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں موجودہ اصطلاح میں "ہم دست" یا "ہم کار" (COLABORATOR) کہہ سکتے ہیں،

سلطان دل ہی دل میں ایک ڈرامے کا منصوبہ تیار کر رہا تھا، وہ ابھی بالکل نوجوان تھا، لیکن اپنے مرتبۂ بلند کے باوجود صحرائی زندگی کی درشتی سے خالی نہ تھا، ساتھ ہی ساتھ وہ تعلیم یافتہ بھی تھا، اس نے تربیت بھی حاصل کی تھی، اس موقع پر یہی چیز خطرناک ثابت ہوئی، کیوں کہ وہ بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ لوگوں کا انداز فکر، انداز کار اور جذبات کی کیفیت کیا ہے؟ وہ اس انسان کی کمزوری سے بخوبی واقف تھا، جو غلامانہ طور پر پلے اور طاقتور بادشاہ کے سامنے جھک

جاتا ہے۔

شہر میں افواہ پھیل گئی کہ سلطان قسطنطنیہ میں کام ختم کر کے اور نہ واپس جا رہا ہے۔

روانہ ہونے سے پہلے اس نے شہر کے میدان میں لوگوں کو جمع کیا، یہ ایک بہت بڑا مجمع تھا، اس موقع پر شہر کے وہ نوا عیان و اشراف بھی تھے جنہوں نے بڑے شوق سے اپنے نام درج فہرست کرائے تھے، یہ سب سکڑتے ہوئے، سر جھکائے، تحائف اور ہدایا کا انبار لیے اپنے کنبوں کے ساتھ سامنے کی صف میں بیٹھے تھے۔

جب یہ لوگ اچھی طرح اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے تو سلطان نے سوال کیا،

"کیا آپ لوگ سچے دل سے اطاعت قبول کرتے ہیں؟"

سب نے متفق اللفظ ہو کر اثبات میں جواب دیا۔

سلطان نے سوال کیا، "آیا دوسرے یونانیوں کو بھی اطاعت کی راہ پر لانے کا وعدہ کرتے ہیں؟"

اس مرتبہ پھر سب کا جواب اثبات میں تھا،

سلطان نے ایک نظر شہنشاہ قسطنطین کے اس کٹے ہوئے سر پر ڈالی، جو اب تک جسٹینیانی کے مجسمے پر لٹک رہا تھا۔ پھر یہ آواز کرخت پوچھا،

"لیکن یونانی ہیں کہاں؟"

سب کے دل دھڑکنے لگے، کسی میں یارائے تکلم نہ تھا،
سلطان نے اور زیادہ بلند آواز اور تحکمانہ لہجے میں کہا،
"زمین پر بیٹھ جاؤ اور سر جھکا لو!"
اور جب انھوں نے سر جھکا لیے، سلطان کے جلادوں نے ایک ایک کر کے سب کی گردن قلم کر دی۔
سب سے آخر میں جو آدمی طلب کیا گیا، وہ گرینڈ ڈیوک آف نوٹارس تھا، وہ اپنے دونوں لڑکوں کے ساتھ اعتماد و اطمینان کے ساتھ سامنے آیا لیکن جب اس نے تازہ کٹے ہوئے اور خون میں لتھڑے ہوئے سر دیکھے تو سمجھ گیا، خود اس کے ساتھ بھی کیا ہونے والا ہے،
ڈیوک تن کر کھڑا ہو گیا اور گویا اپنے ماضی کی نفی کرتا ہوا بولا۔
میں چاہتا ہوں پہلے میرے بچے قتل کیے جائیں ——— تاکہ میں ان کے مستقبل کی طرف سے مطمئن ہو جاؤں،
سلطان نے اپنے دو قول شانوں کو جنبش دی، اور پھر اس کے حکم کے مطابق ڈیوک کے دونوں بیٹے قتل کر دیے گئے۔ پھر حسب فرمان نوٹارس بھی قتل کر دیا گیا۔
سلطان حد درجہ زیرک اور ہوشیار تھا، ضرورت کے وقت نقض عہد بھی کر گزرتا تھا، وہ آدمی کی صورت دیکھتے ہی اس کی خیانت اور غداری کا اندازہ

کر لیتا تھا، بلاشبہ اس نے نوٹاراس اور اس کی جماعت کے بارے میں رائے قائم کر لی تھی کہ ان پر ہرگز اور کسی حالت میں بھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا چنانچہ اس نے سب کا صفایا کر دیا۔

بعد کی صدیوں میں سقوط قسطنطنیہ کے دن جو حوادث رونما ہوئے، ان کے بارے میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں کی گئیں، اور خاص طور پر نوٹاراس کے بارے میں بہت زیادہ خیال آرائیاں ہوئیں کہ فتح قسطنطنیہ میں خود نوٹاراس کا کہاں تک ہاتھ تھا۔؟

اگر غداری ہوئی تو اس وقت جب ترک بندرگاہ کی طرف سے شہر میں آنا شروع ہوئے،

ترک سپاہی کس طرح کر کو پورٹا کے دروازے تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے؟ یہ دروازہ قصر شہنشاہ سے بالکل متصل تھا، اور بندرگاہ سے زیادہ دور نہ تھا، یہ ایک عرصے سے استعمال نہیں کیا جا رہا تھا، حقیقت یہ ہے کہ اسے محاربات صلیبی کے زمانے سے مستقل طور پر بند کر دیا گیا تھا، کیوں کہ یہ پیش گوئی مشہور ہو چلی تھی کہ شہنشاہ فریڈرک شہر میں اسی دروازے سے داخل ہوگا، اس آخری محاصرے کے آخری دنوں میں بہر حال یہ دروازہ کھول دیا گیا تھا، تاکہ سہولت سے لوگ آ کر رات کے وقت فصیل مرمت کیا کریں، یہ دروازہ اسی حلقے میں تھا، جس کا انچارج نوٹاراس تھا۔

یہ بات بھی اہم ہے کہ عین اس وقت جب یونانی باب سینٹ رومانوس کی حفاظت اور دفاع میں جان لڑا رہے تھے، گولوں کی بارش سہہ رہے تھے ٹھیک اسی وقت جسٹینیانی زخمی ہوا، پچاس ترک سواروں کا ایک دستہ سیدھا کرکوپورٹا کے دروازے پہ نمودار ہوا۔ اب تک جس کی حفاظت اور دفاع کی ضرورت ہی نہیں سمجھی گئی تھی، یہ بڑا بر وقت حملہ تھا، اور بغیر اس کے کہ اندر سے ضروری اطلاعات مل گئی ہوں، وجود ہی میں نہیں آسکتا تھا۔

سوال یہ ہے کہ یہ اطلاع ترکوں کو کس نے پہنچائی۔؟

یہ نعرہ کس نے لگایا کہ " شہر پہ دشمن کا قبضہ ہو گیا — "؟

یہ راز شاید ہمیشہ راز ہی رہے گا۔

اس سوال کا جواب بھی نہیں ملتا کہ ترکوں کا ایک بڑا دستۂ سپاہ اس واقعہ کے بعد دروازۂ فانار[1] سے شہر میں کیسے آگھسا؟ یہ پورا حلقہ بھی ڈیوک کی کمان میں تھا، جب بارہ بنی چری، غوں پیکر حسن کے بعد نردبان کے ذریعہ فصیل پہ چڑھے اور شہنشاہ کے خطِ دفاع کو توڑتے ہوئے شہر میں داخل ہوئے، تو انہوں نے اپنی طرف ترکوں کا ایک گروہ آتے دیکھا، ان سے کسی نے تعرض نہیں کیا، اور یہ دروازۂ فانار ہی سے آرہے تھے۔

---

[1] PHANAR

جنگ کے آشوب اور دار و گیر میں اس وقت کہ ہزاروں آدمی ایک دوسرے سے گتھے ہوئے لڑ رہے ہوں، زخمیوں کی صدائے دردناک، دہشت زدہ اور سراسیمہ لوگوں کے فرار، گری پڑی اور خاک و خون میں لتھڑی ہوئی لاشوں کے ہجوم کے درمیان جو مؤرخ بھی لکھنے بیٹھے گا اپنی تحقیق پر مطمئن نہیں ہو سکتا، حتیٰ کہ موقع کا راوی بھی وثوق سے کچھ نہیں بتا سکتا، حقائق اور واقعات پر ذاتی تعصب اور فکر کا رنگ چڑھ ہی جاتا ہے۔ ——— بایں ہمہ نوٹارا اس کو غداری کے الزام سے بری نہیں قرار دیا جا سکتا۔

تصور میں جو مختصر ترین مدت آسکتی ہے، اتنے عرصے میں ساٹھ ہزار یونانی شہر سے لشکر میں اور وہاں سے بندرگاہ منتقل کر دیے گئے، بعد میں یا تو بازار غلاماں میں انہیں فروخت کر دیا گیا، یا تبادلہ کر لیا گیا، اور اس طرح وہ عثمانی مملکت کے طول و عرض میں پھیل گئے۔

جو لوگ غلام بنائے گئے ان میں شہنشاہ کا یار صادق فرانزا بھی تھا، جسے اپنی محبوب بیوی اور بچوں سے جدا کر دیا گیا تھا، اپنے ایک ترکی آقا کی پندرہ ماہ تک خدمت کرنے کے بعد اپنی ذہانت اور فراست کے باعث وہ آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا، پھر وہ ادرنہ پہنچا، جہاں معلوم ہوا اس کی بیوی بھی قیدی بن چکی تھی، ایک سال کی محنت کے بعد وہ فدیہ دے کر اپنی بیوی کو آزاد کرانے میں کامیاب

ہوا، لیکن وہ اپنے دونوں بیٹوں کو بچا سکا، اس کی خوبصورت لڑکی تھامار[1] حرم سلطانی میں وفات پا گئی، اس کی عمر چودہ سال تھی، اور اس کا لڑکا جو بہن سے صرف ایک سال بڑا تھا، سلطان کے احکام بجالانے کے بجائے خودکشی کر کے اس دنیا سے گذر گیا[2]۔ فرانزا نے باقی عمر لکھنے پڑھنے میں گزار دی، اور سقوط قسطنطنیہ سے متعلق اپنے مشاہدات و تاثرات کتاب کی صورت میں مرتب کر ڈالے، جس سے ہمیں اس کتاب کے لکھنے میں بہت مدد ملی ہے۔

خلیل پاشا جس نے سلطان کی بھی خدمت کی تھی، اور شہنشاہ کی بھی، گرفتار کر لیا گیا، اور طرح طرح کی اذیتیں برداشت کر کے ہلاک ہو گیا۔

قسطنطنیہ ایک ترک شہر بن گیا، اور جب سے آج تک ترک ہی چلا آ رہا ہے ترکوں کے سرخ جھنڈے کا نشان ہلال و ستارہ قرار پایا، جو نشانِ دولتِ بازنطیم ہے۔

سینٹ صوفیا اب بھی (بہ نام مسجد آیا صوفیا) قائم ہے، لیکن جسٹینیانی

---

[1] THAMAR

[2] اس واقعہ پر میں تتمہ میں گفتگو کروں گا۔

(مترجم)

کی تصویر زرین گچ سے پوشیدہ کر دی گئی، اور چار میناروں کا اضافہ کر دیا گیا۔

سلطان محمد نے آرتھوڈکس اسقف جناڈیس[1] کو طلب کیا جو مشرقی اور مغربی کلیسا کے اتحاد کا سخت مخالف تھا، اور اسے کلیسا کی سرداری سونپ دی، سلطان نے اسے عصا اور روایتی خلعت پہنا کر دی، اسے ہر طرح سے امداد، تعاون، اور حفاظت کا یقین دلایا، اور شہر کے علاقے فنر میں ایک محل رہنے کے لئے بخشا جہاں اس کے جانشین اب تک حکومت کر رہے ہیں، اس طرح سلطان نے مشرقی اور مغربی کلیسا کے مابین جو شگاف تھا اسے تکمیل تک پہنچا دیا۔

کارڈینل ایزیڈور، ایک سپاہی کے بھیس میں پکڑا گیا، اور بازار میں غلام کی حیثیت سے فروخت کر دیا گیا۔

شہر کو دوبارہ آباد کرنے کے لیے جو اب بالکل ویران ہو چکا تھا، سلطان نے نئے لوگوں کی ہمت افزائی کی کہ آئیں اور بسیں، اس نے ان یونانیوں کو جو بھاگ گئے تھے، پھر دعوت اقامت دی، یہی نہیں بلکہ ان کے لئے مکانات کا بھی فنر کے علاقے میں رعیس کلیسا کے محل کے قریب بندوبست کیا، انہیں کوئی سرکاری عہدہ تو نہیں دیا گیا۔ لیکن کاریگری، صنعت، بنک کاری، تجارت، صرافی وغیرہ کے پیشے انہوں نے سنبھال لیے، اور راحت و آسائش کی زندگی بسر کرنے لگے

---

[1] GENNADIUS

اس نے اپنے تسخیر کردہ ممالک کے بہت سے دیہاتوں اور قصبوں کو پورا کا پورا یہاں منتقل کر لیا۔ سربیا، بلغاریہ اور آرمینیا کے باشندے بہ تعداد کثیر آ گئے۔ یہی وجہ ہے کہ آج قسطنطنیہ بہت سی قسموں، مختلف شکل و شباہت کے لوگوں اور متعدد زبانوں کا گہوارہ ہے۔

سلطان محمد فاتح نے جو ضابطۂ مملکت مرتب کیا تھا، وہ انیسویں صدی تک کارفرما رہا۔ قسطنطنیہ پھر ایک بہت بڑا شہر بن گیا، لیکن اب وہ عیسائیوں کا نہیں، مسلمانوں کا پایۂ تخت تھا۔ اس کا نام بھی استامبول رکھ دیا گیا،

اگر لاطینیوں (یورپینوں) نے ۱۲۰۴ء میں قسطنطنیہ کو برباد نہ کیا ہوتا،

اگر ۱۳۹۶ء میں مسیحی متحد ہو گئے ہوتے،

جب کہ تیمور لنگ نے ترکوں کا قریب

قریب خاتمہ کر دیا تھا۔

اگر صرف پانچ جہازوں کے بجائے جنوا

اور وینس نے اپنا پورا بیڑا شہنشاہ کی

مدد کے لیے بھیج دیا ہوتا ——

—— تو بلاشبہ یہ شہر ترکوں کی

تاخت و تاراج سے بچ سکتا تھا

کاش آخری دنوں میں باشندگان قسطنطنیہ

میں اپنے شہر کو بچانے کا حوصلہ ہوتا۔
کاش ان میں قدیم کارتھیج، یروشلم، اور
جنگ عظیم دوم کے لندن جیسا جذبۂ
مدافعت موجود ہوتا!

کہانی ختم ہوئی، فقط قسطنطین یازدہم اور اس کے مٹھی بھر جاں نثاروں
کی یاد باقی ہے، قسطنطنیہ آخری رومی شہنشاہ، جس کا سلسلۂ نسب
آگسٹس سے ملتا ہے، کی آخری آرام گاہ ہے۔

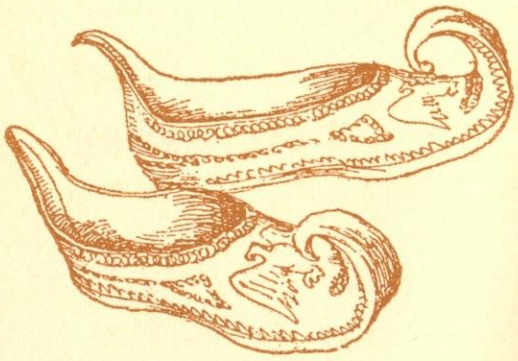

تتمہ

رئیس احمد جعفری

اصل کتاب ختم ہوگئی، اب تتمہ کا آغاز ہوتا ہے، یہ مترجم کی طرف سے ہے!
بغیر کسی ذہنی تحفظ کے میں اعتراف کرتا ہوں، کہ مصنف نے نہایت تحقیق اور
تدقیق کے ساتھ یہ کتاب لکھی ہے، بلاشبہ ہزارہا صفحات پڑھنے کے بعد انہوں
نے چند صفحات سپرد قلم کیے ہوں گے، جو کیفیت ایک مسلمان کی سقوط بغداد کی
داستان پڑھ کر ہو سکتی ہے، سقوط قسطنطنیہ کے واقعات پڑھ کر بالکل وہی ذہنی،
اور قلبی کیفیت ایک مسیحی کی ہونی چاہیئے، سقوط بغداد اور قسطنطنیہ میں بڑی مشابہت
ہے، جس طرح اپنے وقت میں بغداد، تہذیب، تمدن، حضارت و ثقافت،
صنعت و حرفت، تجارت و معیشت اور دولت و ثروت کا مرکز تھا، اسی
طرح اپنے وقت میں قسطنطنیہ کا یہی حال تھا، جس طرح معتصم اپنی ذاتی خوبیوں

کے باوجود اس تدریجی انحطاط و ادبار کو نہ روک سکا، جو درحقیقت کئی صدیوں سے شروع ہو چکا تھا، اسی طرح شہنشاہ پالیولوگس انقلاب گردوں کی زد میں آنے کے بعد بے بس ہو گیا، جس طرح معتصم، ہارون کا جانشین تھا، مگر ہارون کی قوت و شوکت سے محروم تھا، اسی طرح پالیولوگس قسطنطین اعظم کا جانشین تھا، مگر اس کے دبدبے اور طنطنے کا کوئی شائبہ اس میں نہ تھا، جس طرح معتصم، اپنے وزیر اعظم ابن علقمی کی سازش کا شکار بنا، اسی طرح بعض مؤرخین کے نزدیک پالیولوگس، اپنے امیر البحر اور مملکت کے سب سے بڑے فرد، گرینڈ ڈیوک ناٹوراس کی سازش کا ہدف بنا، جس طرح معتصم اور ابن علقمی کی آویزش طائفی اختلافات، تعصبات اور باہمی نارواداریوں کا نتیجہ تھی، بالکل اسی طرح پالیولوگس، اور گرینڈ ڈیوک کے اختلافات کی نوعیت تھی، ایک کلیسائے یونان اور کلیسائے روم کی وحدت کا قائل تھا دوسرا اس کا بدترین مخالف، جس طرح قسطنطنیہ کا فاتح سلطان محمد ثانی اپنے جلو میں جنوا اور وینس کے عیسائی سپاہیوں کے دستے رکھتا تھا، اسی طرح بغداد کا فاتح ہلاکو خاں اپنے جلو میں مسلمان امراء، علماء اور کچھ سلاطین تک کو رکھتا تھا جس طرح کچھ مسلمان ایسے تھے، جنہوں نے ہلاکو خاں کا ساتھ دیا، اسی طرح کچھ عیسائی ایسے تھے جنہوں نے سلطان محمد فاتح کا ساتھ دیا —— لیکن ایک بہت بڑا فرق بھی تھا۔

وہ فرق یہ تھا کہ ہلاکو خاں نے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، اس نے

صرف مستعصم کی جان ہی لینے پر اکتفا نہیں کی، شہر کی ایک ایک مسجد، خانقاہ عمارت ہر چیز کو خاک کا ڈھیر بنا دیا، وہ عالی شان عمارتیں، وہ عالی شان ایوان وقصور، وہ عالی شان حمام، اور بازار جن کی تعریف و توصیف سے تاریخ کے ہزاروں صفحات بھرے پڑے ہیں، جن کا ذکر کرتے ہوئے دوسرے مورخین کا قلم خون کے آنسو روتا ہے، سب تو دہ خاک بن گیے۔ درخت تک کاٹ ڈالے گیے، سبزہ تک پامال کر دیا گیا، باشندگان شہر میں سے کسی کو امان نہ ملی، بچے، بوڑھے، جوان، سب تیر اجل کا نشانہ بنے، آج بغداد کا ذکر صرف کتابوں میں ہے، لیکن بغداد کہاں ہے؟ ——

کیا یہی کیفیت قسطنطنیہ پر بھی گزری؟ واقعات وحقائق کا جواب نفی میں ہے، قسطنطنیہ آج بھی موجود ہے، اور اسی شان سے موجود ہے، جس طرح کبھی تھا! سلطان محمد نے اپنے سپاہیوں کو شہر کی ایک اینٹ بھی اپنی جگہ سے کھسکانے کی اجازت نہیں دی، اس کی عظمت اور خوب روئی میں کوئی فرق نہیں آنے دیا، لیکن بغداد تو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہو گیا،

امر واقع یہ ہے کہ ایک مسلمان جب کبھی سقوط بغداد پر قلم اٹھائے گا تو سعدی کا نوحہ

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں
بر زوال ملک مستعصم امیر المومنیں

ضرور زبان قلم پر آجائے گا، اسی طرح جب کوئی عیسائی سقوط قسطنطنیہ کی داستان لکھنے بیٹھے گا تو اس کی آنکھیں بھی آنسو برسائینگی، اور قلم کا کلیجہ بھی شق ہو جائے گا"!

سقوط قسطنطنیہ کا مصنف بھی ایک عیسائی ہے، اور کوئی شبہ نہیں اس دل خراش موضوع پر قلم اٹھاتے ہوئے، وہ خون کے آنسو رویا ہے، آدمی واقعات و حقائق کے بیان میں کتنا ہی محتاط ہو، اور تعصب و تنگ نظری سے کتنا ہی دور ہو، ممکن نہیں کہ جہاں رونے کا موقع ہو ہنسنے لگے، یہ اگر کمزوری ہے تو انسانی فطرت ہے تو اس کتاب کے مصنف کوشش کے باوجود اس سے بچ نہیں سکے ہیں،

قسطنطنیہ کے سقوط پر انہیں خون کے آنسو بہانے کا حق تھا، اور کون ہے جو اس حق کو ان سے چھیننے کی کوشش کرے، لیکن بیان واقعات میں ان سے کچھ غلطیاں بھی ہوئی ہیں، ضروری ہے کہ ان پر ایک مختصر سی نظر ڈال لی جائے،

قبل اس کے کہ ان غلطیوں پر گفتگو کی جائے، ایک مرتبہ پھر میں کھلے دل سے اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ مصنف نے جہاں انتہائی تحقیق اور عرق ریزی سے یہ کتاب لکھی ہے، وہاں تعصب اور جانب داری سے بچنے کی پوری کوشش کی ہے، اور اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے

ہیں، بلکہ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ ارادی طور پر ان سے کوئی غلطی نہیں ہوئی ہے جو غلطیاں ہوئی ہیں وہ نتیجہ ہیں نقص مطالعہ کا جو کچھ انہوں نے پڑھا اس کو پیش نظر رکھ کر دیانتداری کے ساتھ نتائج اخذ کیے اور اپنے نتائج مطالعہ کا دلیری کے ساتھ اظہار بھی کر دیا، جس طرح انہوں نے سلطان محمد یا مسلمانوں کی بعض کمزوریوں پر اظہار خیال کیا ہے، اس سے کہیں زیادہ شہنشاہ قسطنطنیہ، عمائدین مسیحی، اشراف مملکت و اعیانِ حکومت اور مجاہدین صلیب کی کمزوریوں کو انہوں نے کہیں زیادہ سختی اور شدت کے ساتھ بے نقاب کیا ہے، رعایت کسی کے ساتھ نہیں کی ہے۔ جانبداری کسی کے ساتھ نہیں برتی ہے، اور یہی ان کے مخلص اور دیانت دار ہونے کا ثبوت ہے۔

ساری کتاب پڑھنے کے بعد جو تاثرات قائم ہوتے ہیں، وہ یہ ہیں:-

۱۔ ترک تبلیغ اسلام نوک شمشیر کے ذریعہ بھی کیا کرتے تھے۔

۲۔ سلطان محمد انتہائی ناروادار تھا،

۳۔ تنقض عہد بھی کر گزرتا تھا،

۴۔ گرینڈ ڈیوک کے ساتھ اس نے جو سلوک کیا، ہرگز مناسب نہ تھا۔

۵۔ فرانزا نے اپنی خود نوشت میں جو الزام اس پر عائد کیا ہے، وہ حد درجہ اندوہناک ہے۔

اختصار کے ساتھ میں انہی امور تک اپنی گفتگو محدود رکھوں گا۔

سب سے پہلا مسئلہ ترکوں کی ناروا داری اور رواداری کا آتا ہے۔

سلاطین عثمانیہ جہاں اور خوبیوں اور خصوصیتوں کے اعتبار سے یگانہ تھے وہاں ان میں ایک اور صفت بھی تھی، وہ تھی رواداری، وہ ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے ہرگز اسے پسند نہیں کرتے تھے کہ دین و مذہب کے معاملے میں کسی پر جبر کریں، وہ اس قرآنی ارشاد کے رمز آشنا تھے کہ

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (دین کے معاملہ میں جبر وجود روا نہیں (کیونکہ) ہدایت گمراہی سے ممیز ہو چکی ہے) اب یہ ہر شخص کا خود کا معاملہ ہے کہ وہ جو راستہ چاہے اختیار کرے، خواہ گمراہی خواہ ہدایت!

۱۳۴۵ء میں مراد خاں نے بازنطینی سلطنت کے ایک امیر الامراء کنستانٹین کوزین کی بغیر کسی طمع و صلے کے مدد کی، اس نے اپنی حسین و جمیل لڑکی شہزادی تھیوڈورا کی خود اپنی خواہش اور مرضی کے مطابق مراد خاں سے شادی کر دی، مراد خاں نے شادی کے بعد صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ اپنے آبائی مذہب پر قائم رہ سکتی ہے، کیونکہ از روئے مذہب مسلمان، اہل کتاب عورتوں سے شادی کر سکتے ہیں، چنانچہ مراد خاں نے کبھی شہزادی تھیوڈورا سے یہ فرمائش نہیں کی کہ وہ اسلام قبول کرے۔

مراد اول کی ساری زندگی عیسائیوں سے لڑتے، عیسائی فرمانرواؤں سے

جنگ کرتے گزری لیکن اس نے عام عیسائیوں پر کبھی کسی قسم کی زیادتی روا نہیں رکھی۔ ان کے مذہبی معاملات میں کبھی کسی قسم کی مداخلت نہیں کی انہیں اپنے مذہب پر قائم رہنے کے سلسلے میں ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔

۱۳۵۸ء میں یونانی کلیسا کے بطریق اعظم نے پوپ اربن ششم کو ایک خط میں لکھا تھا کہ مراد نے کلیسا کو کامل آزادی عطا کر دی تھی، اور شاید یہ اس کا نتیجہ تھا کہ ۱۳۶۰ء اور ۱۳۸۹ء کے درمیان بطریق اعظم کے دور میں کوئی ایک شکایت بھی عثمانیوں کے ہاتھوں ارباب کلیسا کی بدسلوکی کی درج نہیں ملتی۔[1]

عثمانی ترکوں کو بازنطینی حکومت سے مسلسل آویزش رہی، قسطنطنیہ کے بادشاہوں نے ہمیشہ اس کی کوشش کہ ترک یورپ سے نکال دیے جائیں، انہوں نے اندرونی سازشوں اور علانیہ جنگوں کا سلسلہ برابر جاری رکھا، لیکن ۱۴۵۳ء میں جب بے انتہا جانی و مالی قربانی کے بعد محمد غازی نے قسطنطنیہ کو فتح کیا تو اس نے عیسائیوں سے کوئی انتقام نہیں لیا۔

داخلہ کے وقت تھوڑا بہت کشت و خون ضرور ہوا، لیکن داخلے کے بعد ترکوں کی تلوار نیام میں پہنچ گئی، حالانکہ عیسائی فاتح مسلمانوں کو کھیرے ککڑی کی طرح کاٹ ڈالنے کے عادی تھے ——— داخلے کے چند گھنٹوں کے بعد

---

[1] ہربرٹ گبن صفحہ ۱۸۶ بحوالہ دولت عثمانیہ جلد اول

کوئی قتل عام نہیں ہوا، آتش زنی بھی زیادہ نہیں ہوئی، سلطان نے گرجاؤں اور دوسری عمارتوں کو محفوظ رکھنے میں پوری کوشش کی، اور وہ اس میں کامیاب رہا۔[1]

قسطنطنیہ میں فاتحانہ داخلے کے بعد محمد نے امن عام کا اعلان کر دیا، جو عیسائی خوف و دہشت کے باعث شہر سے فرار ہو گئے تھے، ان کی جان و مال اور آبرو کی حفاظت کا ذمہ لیا، اور ترغیب دی کہ آئیں، بسیں اور اپنے اپنے کام میں لگ جائیں۔ اس نے یونانی کلیسا کے بطریق کو پھر سے اس کے متبعین پر بحال کیا، اور کلیسا کی سرپرستی قبول کرنے کا اعلان کیا، اور ایک خاص فرمان کے ذریعہ یونانی بطریق کی ذات محترم قرار دی گئی، نیز کلیسا کے عہدہ دار تمام محاصل سے مستثنیٰ کر دیے گئے، اسی فرمان کی رو سے عیسائیوں کو مذہبی رسوم ادا کرنے کی مکمل آزادی دی گئی، نیز یہ اجازت بھی دی گئی کہ وہ اپنے معاملات و قومی مسائل اپنی قومی عدالتوں کے ذریعہ طے کر لیا کریں علاوہ ازیں عیسائیوں کے قانون نکاح اور قانون وراثت میں کوئی مداخلت نہیں کی۔

مسٹر آرنلڈ نے اپنی کتاب پریچنگ آف اسلام (دعوت اسلام) میں فتح

---

[1] لارڈ ایورسلے ص ۸۸ بحوالہ دولت عثمانیہ

قسطنطنیہ پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"ترکوں نے صرف یہی نہیں کیا، بطریق کی عزت قائم رکھی، بلکہ عدالت کے (جس میں فریقین عیسائی ہوں) اختیار بھی دے دیے۔"

اسی طرح لارڈ ایورسلے نے بھی اعتراف کیا ہے کہ

"محمد کی یہ عظیم الشان رواداری اس عہد کی مسیحی یورپین حکومتوں کے سیاسی اخلاقیات سے بہت آگے تھی۔"

ڈیوک نوٹارا اس جو افواج قسطنطنیہ کا سپہ سالار اعظم تھا، جب گرفتار کر کے لایا گیا تو محمد نے نہ صرف اسے معاف کر دیا، بلکہ یہاں تک نوازش کی کہ اس کی بیوی کی عیادت کے لئے گیا، جو علالت اور غم شکست کے باعث پریشان تھی نہایت نرمی اور احترام سے جیسے کوئی لڑکا ماں کو سمجھائے اسے تسلی تشفی دی کئی اسیر جنگ افسروں کا زر فدیہ اس نے خود ادا کیا[1]

۱۵۲۲ء میں سلیمان اعظم نے روڈس کو فتح کر لیا، یہاں کے عیسائی جنگجوؤں کو جو محاربات صلیبی کی یادگار تھے، اور مسلمانوں کو ہمیشہ تنگ کیا کرتے تھے اجازت دے دی کہ وہ بارہ روز کے اندر اپنے تمام اسلحہ اور ہر قسم کے سامان کو لے کر جہاں چاہیں چلے جائیں، جاتے وقت اگر جہازوں کی قلت

---

[1] گبن ج ص۱۰۵ بحوالہ دولت عثمانیہ

محسوس کریں، تو عثمانی سلطنت کے جہاز بھی استعمال کر سکتے ہیں۔

یہ تو ہوا جنگ کرنے والوں کا حال عام باشندوں کو سلطان نے کامل مذہبی آزادی عطا کر دی، اعلان کیا کہ ان کے کلیساؤں سے کسی قسم کا تعرض نہ کیا جائے، اور ——— پانچ سال تک ان سے کسی قسم کا محصول جزیہ (ٹیکس) بھی نہیں لیا جائے گا،

سلطان سلیمان اعظم (۱۵۲۰ء، ۱۵۶۶ء) نے غیر مسلم رعایا کے ساتھ اتنی زیادہ رعایت برتی اور ایسے حسن سلوک کا مظاہرہ کیا کہ عیسائی فرمانرواؤں کی عیسائی رعایا بھاگ بھاگ کر مسلمانوں کے دامن میں آ کر پناہ ڈھونڈتی تھی خلفاء عثمانیہ کی غیر مسلم رعایا، اور مسیحی یورپ کے زرعی غلاموں (Serfs) کے فرق مراتب کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سرحدی عیسائی ممالک کے باشندے بھاگ بھاگ کر سلطنت عثمانیہ میں پناہ لیتے تھے اور اپنے ہم مذہب عیسائی آقاؤں کے جور و تعدی پر ترکوں کی حکومت کو ترجیح دیتے تھے، لارڈ کریسی سلیمان اعظم کے ہم عصر مصنف کا قول نقل کرتا ہے۔

"میں نے گروہ در گروہ ہنگری دہقانوں کو اپنے جھونپڑوں میں آگ لگا کر اور اپنے بیوی بچوں اور سامان کاشت لے کر ترکی علاقوں میں بھاگ کر جاتے ہوئے دیکھا ہے، جہاں وہ جانتے تھے کہ عشر کے علاوہ ان پر اور کسی قسم

کا محصول یا تکلیف دہ بار عائد نہیں کیا جائے گا۔[1]

نومبر ۱۶۸۹ء میں سلطنت عثمانیہ کی وزارت عظمیٰ مصطفےٰ کوپریلی کے ہاتھ میں آئی، یہ بڑا دین دار صالح اور مدبر انسان تھا، اس نے زوال پذیر سلطنت کی تمام اندرونی خرابیوں کو تیزی کے ساتھ دور کیا، رعایا میں اعتماد اور اطمینان پیدا کیا، عیسائیوں کے ساتھ اس نے خاص طور پر حسن سلوک کا مظاہرہ کیا، اس نے اپنے حاکموں کو سخت سزائیں دیں، جن کے بارے میں شبہ بھی ہو گیا کہ عیسائیوں کے ساتھ کسی قسم کی بدسلوکی کرتے ہیں، جزیہ کے علاوہ ہر محصول سے انہیں آزاد کر دیا۔ اور جزیہ کی رقم بھی اتنی معمولی رکھی جو غریب سے غریب آدمی کو بھی گراں نہیں گزر سکتی تھی، ادھر کچھ عرصے سے عیسائیوں کو نئے گرجا اور کلیسا بنانے کی اجازت حاصل کرنے میں سخت دشواریاں لاحق ہوتی تھیں، مصطفےٰ کوپریلی نے عام فرمان کے ذریعہ انہیں عام اجازت دے دی کہ وہ جتنے گرجا اور کلیسا چاہیں بنوائیں، یونانی کلیساؤں کے پیروؤں پر چونکہ رومی کلیسا کے ارباب اقتدار لرزہ خیز سختیاں کرتے تھے، ان سہولتوں نے انہیں مسلمانوں کا دل سے ممنون کر دیا، اور وہ ان کی ترقی اور جاہ و اقبال کی دعائیں کرنے لگے۔

۱۶۹۷ء میں حسین کوپریلی کو سلطان مصطفےٰ ثانی (۱۶۹۵ء-۱۷۰۳ء) نے اپنا

---

[1] کریس ج ۱ ص ۳۳۸-۳۳۶ بحوالہ دولت عثمانیہ

وزیر اعظم بنایا، یہ بھی اقلیتوں اور غیر مسلموں کے ساتھ بہت حسن سلوک سے پیش آتا تھا، اس نے بوسینا کے عیسائیوں کا ایک سال کا جزیہ معاف کر دیا، رومیلیا کی عیسائی رعایا کے ذمہ جو محصول باقی چلا آرہا تھا، اسے ایک قلم معاف کر دیا، جس سے عیسائیوں کے دل میں مسلمانوں کی عظمت پیدا ہوئی۔

یونانی عیسائیوں کے ساتھ ترکوں کا برتاؤ سراسر لطف و محبت، رواداری اور عالی ظرفی کا تھا۔ ترکی حکومت کے ترجمان نے ارباب عالی کے نام سے ایک بہت بااختیار اور معزز منصب قائم کیا، اور اس پر ۱۷۶۹ء میں یونانی عیسائی کو فائز کیا، یہ بڑا اہم سیاسی منصب تھا، رفتہ رفتہ یہ منصب وزارت خارجہ کا اہم ترین منصب بن گیا، ہمیشہ اس عہدۂ عالی پر یونانی ہی مقرر ہوتے رہے، اس طرح سلطنت عثمانیہ کے معاملات کی کنجی ان ہی عیسائیوں کے ہاتھ میں تھی، پھر کچھ مدت بعد ایک اور منصب اسی طرح کا محکمۂ بحریہ میں قائم کیا گیا، اور یہ بھی ایک یونانی ہی کو تفویض ہوا۔

ترک عیسائیوں کے جذبات کا بہت پاس و لحاظ رکھتے تھے، رعایا کا لفظ ایک حد تک حقارت کا لفظ سمجھا جاتا تھا، لہٰذا انہوں نے اس لفظ ہی کو بدل دیا، اور ان عیسائیوں اور یونانیوں کو رعایا کے بجائے معاون کہنے اور لکھنے لگے۔

ترک اپنی رواداری اور عالی ظرفی میں حد اعتدال سے تجاوز کر گئے تھے،

انہوں نے اپنی عیسائی رعایا کو اجازت دے دی تھی کہ وہ ترکی میں رہ کر جس یورپین حکومت کی چاہیں رعایا بن جائیں، اس رعایت سے عیسائیوں نے بہت ناجائز فائدہ اٹھایا، یہ دھڑلے سے قوانین ملکی کی خلاف ورزی کرتے تھے، اور تعزیر و عقوبت سے محفوظ رہتے تھے، یہ ترکوں کے دوش بدوش پہلو بہ پہلو رہتے تھے اور ان تمام حقوق سے متمتع ہوتے تھے جو کسی ترک کو حاصل ہو سکتے تھے لیکن، "غیر ملکی" ہونے کے باعث فائدہ ترکوں سے زیادہ اٹھاتے تھے، یہ تجارت کرتے تھے، مگر محصول نہیں دیتے تھے، یہ تجارتی قوانین کی خلاف ورزی کرتے تھے، لیکن پولیس انہیں گرفتار بھی نہیں کر سکتی تھی، کیوں کہ جس یورپین حکومت کی ترکی میں رہ کر یہ "رعایا" تھے، اس کا سفیر یا قونصل انہیں بچانے کے لیے موجود ہوتا تھا، انگریز مورخ فضلے حیرت کے ساتھ ان مراعات کا ذکر کرتا ہے۔ اور لکھتا ہے

"یہ ہر سزا سے محفوظ تھے"!

۱۸۲۰ء میں یونانیوں نے اچانک ترکوں کے خلاف بغاوت کی، اور مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا، ترکی قلعوں کے جن بے بس و بے دست و پا ترکی دستوں کو امان دے کر داخل ہوئے، انہیں نقض عہد کر کے بے دردی اور سفاکی کے ساتھ قتل کر ڈالا، عورتوں اور بچوں تک کو ذبح کرنے میں تامل نہیں کیا، اس بغاوت کو دبانے کے لئے محمد علی پاشا کا ہونہار بیٹا ابراہیم پاشا آگے بڑھا، اور اس

نے انہیں کچل کر رکھ دیا - ۱۸۲۵ء میں وہ تواریخو میں داخل ہوا، یہ وہ جگہ تھی جہاں یونانیوں نے بری طرح بدعہدی کر کے مسلمانوں کو قتل کیا تھا۔ ان کی عورتوں اور بچوں تک کی جان لے لی تھی، اب وہ سہم رہے تھے کہ دیکھئے ترک فاتح ان کے ساتھ کیا برتاؤ کرتا ہے۔ لیکن ابراہیم پاشا مسلمان تھا، اور ایک مسلمان کی حیثیت سے وہ جانتا تھا کہ بدعہدی سب سے بڑا گناہ ہے، چنانچہ اس نے

"معاہدے کے مطابق پورے یونانی
دستے کو فرانسیسی اور آسٹروی جہازوں
پر روانہ کر دیا۔ مسلمانوں کا ایک گروہ
جسے تواینو کے قتل عام کی یاد اب تک
بے چین کیے ہوئے تھی، انتقام کی فکر
میں اکٹھا ہو گیا، مگر ابراہیم نے پیش بینی
کر کے عیسائیوں کی حفاظت کی تدبیر پہلے
سے کر لی تھی، سوار فوج کے ایک دستے
نے ترکوں کو قریب آنے سے روکے رکھا
اور رہتے یونانی، عرب پیدل فوج کی
سنگینوں کے سائے میں جہازوں تک
پہنچا دیئے گئے۔

سلطان محمد ثانی (۱۸۰۸ء، ۱۸۲۹ء) نے غیر مسلموں کے ساتھ کامل طور پر مراعات ملحوظ رکھیں، اسے جب یہ شکایت پہنچی کہ جزیہ کی وصولی میں بعض اوقات بعض حکام و عمال ذمیوں عیسائیوں پر سختی روا رکھتے ہیں تو اس نے قدیم طریقے کو منسوخ کر کے وصولیِ جزیہ کا کام ایک مجلس کے سپرد کر دیا جس کے ارکان یہ تھے۔

۱۔ قاضی۔ ۲۔ صوبے کا گورنر۔ ۳۔ عیسائی سردار۔

اس طرح جزیہ کی وصولی کے سلسلہ میں کسی تعدی اور زیادتی کا امکان باقی نہ رہ گیا،

سلطان عبد المجید خاں (۱۸۳۹ء، ۱۸۶۱ء) نے اپنے دور حکومت میں عیسائیوں کو مزید حقوق و مراعات عطا کیے، ایک فرمان کے ذریعہ (۱۸۵۶ء) انہوں نے اعلان کیا،

"ان تمام حقوق کی جو نصاریٰ اور
دوسرے فرقوں کو دیئے گئے ہیں،
از سر نو توثیق کی جاتی ہے، نیز ان حقوق
و مراعات پر بلا تاخیر نظر ثانی کر کے
زمانہ اور سوسائٹی کی ضرورت کے
مطابق انہیں ترقی دی جائے گی، اس
غرض سے بطریق کے زیر صدارت ایک

مجلس منعقد کی جائے گی، جو مذکورہ بالا
مسائل پر بحث کر کے اپنی رائے باب عالی
میں پیش کرے گی، سلطان محمد فاتح
نے جو حقوق بطریق کو دیے تھے، ان
میں اضافہ کیا جائے گا، اور آئندہ
بطریق کا انتخاب تمام عمر کے لیے ہوا
کرے گا۔"

سلطان عبدالمجید نے اپنے فرمان میں یہ بھی اعلان کیا کہ :-

"موجودہ کلیساؤں اور عیسائی مدرسوں
شفاخانوں اور قبرستانوں کی مرمت
کی عام اجازت ہے، لیکن اگر کسی جدید
کلیسا، مدرسہ، قبرستان یا ہسپتال کے
تعمیر کرنے کی ضرورت ہو اور بطریق
یا اس فرقے کا مذہبی پیشوا اسے منظور
کرے تو ہر تعمیر کا نقشہ باب عالی میں
پیش کیا جائے گا، اور اگر کوئی (خاص)
وجہ مانع نہ ہوئی تو سلطان نقشہ ملاحظہ

فرماکر تعمیر کی منظوری خود صادر فرمائے
گا۔

ترکی حکومت اپنی رعایا کو اس کی شورہ پشتی، بغاوت پسندی اور غداری کے باوجود، ہر قسم کی مذہبی، سیاسی اور سماجی سہولتیں دیتی تھی، ترکوں نے اپنی مختلف اللسان رعایا پر کبھی صرف ترکی زبان ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ اسے اپنی زبان برتنے اور اسے ترقی دینے کی پوری اجازت تھی

چنانچہ سلطان عبدالمجید خاں نے اپنے فرمان اصلاحات میں بالفاظ واضح اعلان کیا ہے۔

"ایک ضابطۂ تجارت وضابطۂ فوجداری
نیز وہ تمام قواعد وضوابط جو مخلوط عدالتوں
سے متعلق ہیں، حتی الامکان جلد از جلد
شائع کر دیے جائیں گے، اور سلطنت
عثمانیہ میں جتنی زبانیں مستعمل ہیں ان
سب میں ان کا ترجمہ کر دیا جائے گا"

اس فرمان میں سلطان عبدالمجید خاں نے مفتی اعظم سے صلاح ومشورہ کے بعد یہ بات بھی صاف کر دی کہ:۔

"چونکہ محاصل عائد کرنے میں مساوات

برتی جائے گی، اس لئے انصاف کا
تقاضا یہ ہے کہ مسلمانوں کی طرح عیسائی
اور دوسرے فرقے کے لوگ بھی فوج
میں داخل ہوں، لیکن انہیں فوجی
خدمات کے معاوضہ میں نقد رقم
پیش کرکے فوجی خدمت سے مستثنیٰ
ہونے کی اجازت بھی ہوگی!"

۱۸۶۰ء میں دروزی اور ماردنی فرقوں میں خون ریز فساد برپا ہوگیا، اوّل الذکر مسلمان تھے، ثانی الذکر عیسائی، ماردنی فرقے کے لوگوں نے قتل و غارت کی ابتدا کی، لیکن جب دروزی ترکی بہ ترکی جواب دینے لگے، تو وہ چیخ اٹھے، ماردنی فرقے کے عیسائیوں نے مسلمانوں کو خوب قتل کیا، اور لوٹا۔ اسی طرح دروزیوں نے بھی، عیسائیوں کو بے تامل موت کے گھاٹ اتارا، اور برباد کیا، چونکہ ماردنی کمزور تھے، اور دروزی تگڑے، اس لئے نتیجۃً زیادہ نقصان ماردنی عیسائیوں کو۔ جانی و مالی ——— برداشت کرنا پڑا۔

لبنان حکومت ترکیہ کا ایک زیر نگیں صوبہ تھا، یہاں کی پولیس اور فوج ترک تھی وہ بھی ماردنی فرقے کے ظلم و تعدی اور شرارت سے نالاں تھی، اس نے دروزیوں کو روکنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی، بلکہ ایک حد تک چشم پوشی سے کام

لیا۔

لیکن عیسائیوں کا یہ قتل اور ان کی مظلومیت ایک سچا مسلمان امیر عبدالقادر جزائری نہ دیکھ سکا، یہ الجزائر کا مجاہد جسے فرانس نے جلاوطن کر دیا تھا، اور جو شام کے ایک گوشے میں عزلت کی زندگی بسر کر رہا تھا، عیسائیوں کے بچانے کے لئے میدان میں کود پڑا، ایک فرنچ مورخ کے الفاظ ہیں۔

دمشق میں اگر عبدالقادر نہ ہوتا تو ایک
عیسائی کی صورت نہ دکھائی دیتی، یہ
عرب بہادر جس نے سولہ سال تک
فرانسیسیوں سے نہایت شدت
کے ساتھ جنگ کی، دمشق میں تنہائی
کی زندگی بسر کر رہا تھا، آگ کے شعلے
پہلی ہی مرتبہ بھڑکے تھے، اور ریاندوں
کی صدا پہلی ہی مرتبہ بلند ہوئی تھی،
کہ اس نے بلا کسی پس و پیش کے
عیسائیوں اور ان کے قاتلوں کے درمیان
اپنے آپ کو ڈال دیا، ایک چھوٹے
سے (رضاکار) دستے کے ساتھ اس

نے عیسائیوں کو عوام الناس سے بچھڑایا
اور اپنا محل انہیں رہنے کو دیا جو ہزاروں
کی تعداد میں آکر پناہ گزیں ہونے لگے
اس نے عیسائیوں کے سکونتی مقام پر
پہرہ بندی کر دی، اس شخص نے جو
اولاد پیغمبر اسلام تھا، اور فرانس کا قدیم
دشمن تھا، ایک سے زیادہ مرتبہ اپنی
جان کو خطرے میں ڈالا اور ان خونخوار
ٹولیوں کو پسپا کیا، جو اسلام اور ترکی
کے لئے باعث ننگ تھیں، عبدالقادر
نے صرف یہی نہیں کیا، بلکہ ان قیمتوں
پر پوشاک کے لئے بے دریغ روپیہ
صرف کیا، جنہیں اس نے موت کے
پنجے سے رہائی دلائی تھی ——
پھر اس نے خود اپنی نگرانی میں عیسائیوں
کو بیروت پہنچایا، جہاں انہیں کسی قسم
کا خطرہ نہ تھا، اس کا یہ ایثار، اس کی

یہ شرافت اور اس کی یہ بہادری، ایک
لمحے کے لئے بھی کم نہ ہوئی، اس کی
زندگی کا یہ باب کتنا شاندار ہے۔
جس کے آگے ہر کارنامہ مدھم پڑ جاتا
ہے [1]

حکومت ترکیہ بھی خاموش نہ بیٹھی رہی، یورپ میں احتجاج شروع ہوا اور ترکی حکومت نے وہ کیا جو اسے کرنا چاہئے تھا، خود اپنے وزیر خارجہ فواد پاشا کو بھیجا، جنہوں نے وہاں پہنچتے ہی حالات پر قابو پا لیا، ان کے حکم سے غفلت اور چشم پوشی کے جرم میں ایک سو گیارہ ترک سپاہی گولی سے مارے گئے، احمد پاشا والی دمشق کو قتل کی سزا دی گئی، بہت سے دروزی بلا وطن کر دیئے گئے، خورشید پاشا حاکم بیروت کے لئے موت کی سزا تجویز ہوئی، عیسائیوں کے نقصانات کی تلافی کے لئے سات کروڑ پچاس لاکھ قرش رقم باب عالی نے منظور کی۔

۱۸۶۸ء میں سلطان عبدالعزیز نے ایک عدالت عالیہ قائم کی جس کے ججوں میں عیسائی اور مسلمان برابر تھے۔

اب میں یہ بتاؤں گا کہ سلطان محمد فاتح نے صوفیہ کو انتہائی رواداری فرمائی

---

[1] تاریخ دولت عثمانیہ از ولادن بیر ص ۵۰۶

تھا، بلکہ دوسرے مذاہب کا احترام بھی کرتا تھا اور ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مراعات ملحوظ رکھتا تھا، اس کتاب کے فاضل مصنف نے یہ تو بتا دیا کہ گناڈیس کو محمد نے کلیسائے یونان کا سربراہ بنا دیا تھا، اور اسے کچھ سہولتیں اور رعائتیں بھی دی تھیں، لیکن ان سہولتوں اور رعائتوں کے اس پہلو کو نظر انداز کر دیا ہے، جس سے سلطان محمد فاتح کی عظمت نمایاں ہوتی ہے، شکر ہے دوسرے عیسائی مورخین نے اس باب میں بخل سے کام نہیں لیا ہے۔

فتح قسطنطنیہ کے بعد اس نے رومی کلیسا اور کلیسا کے بطریق اعظم گناڈیس، اور عام عیسائیوں کے ساتھ کیا کیا، اس کی یہ تفصیل بھی پیش نظر رکھنی ضروری ہے۔

یکم جون کو سلطان نے امن عام کا اعلان کیا، اور ان تمام عیسائیوں کو جو قسطنطنیہ سے بھاگ گیے تھے، واپس آنے کی دعوت دی، اس نے ان کی جان و مال کی حفاظت کا ذمہ لیا، اور انہیں آمادہ کیا کہ آکر اپنے پیشوں اور کاروبار میں بدستور مشغول ہو جائیں، اس کے بعد اس نے یونانی کلیسا کے بطریق کو از سر نو اس کے عہدہ پر مامور کیا، اور کلیسا کی سرپرستی قبول کی، ایک خاص فرمان کے ذریعہ یونانی بطریق کی ذات محترم قرار دی گئی، نیز اس کے کلیسا کے دوسرے عہدہ دار تمام محاصل سے بری کر دیئے گیے، اس فرمان کے [illegible] یونانیوں کے نصف گرجے انہیں واپس کر دیئے گیے، اور ان کو اپنے

مذہبی رسوم ادا کرنے کی پوری آزادی دے دی گئی، اس فرمان میں سلطان نے انہیں اس امر کی بھی اجازت دی کہ وہ اپنے قومی معاملات اپنی ملی عدالتوں میں طے کر لیا کریں، ان عدالتوں کا صدر کلیسا کے بطریق جارج گناڈیس GENNADIUS کو مقرر کیا، جو خود یونانیوں کا منتخب کردہ تھا سلطان نے یونانیوں کے قانون نکاح اور قانون وراثت کو بدستور قائم رکھا اور ان کا نفاذ بطریق اور مذہبی عدالتوں کے سپرد کیا، پروفیسر آرنلڈ اپنی مشہور کتاب "دعوت اسلام" میں سلطان محمد فاتح کی اس روادارانہ کے متعلق لکھتے ہیں،

"سلطان محمد ثانی نے قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے اور شہر میں امن ہونے کے بعد پہلا انتظام یہ کیا کہ وہ یونانی کلیسا کا حامی اور سرپرست بنا تاکہ عیسائی اس کی اطاعت قبول کریں، عیسائیوں پر سختی ہونے کی ممانعت کر دی، اور ایک فرمان جاری کیا، جس کے بموجب قسطنطنیہ کے نئے بطریق کو اور اس کے جانشینوں اور ماتحت اسقفوں کو قدیم اختیارات جو حکومت سابقہ میں ان کو حاصل تھے دیے گئے، اور جو ذرائع ان کی آمدنی کے تھے وہ بحال ہوئے، اور جن قواعد سے وہ مستثنیٰ تھے، بدستور مستثنیٰ رہے، گناڈیس کو جو ترکوں کی فتح کے بعد قسطنطنیہ کا پہلا بطریق ہوا، سلطان نے اپنے ہاتھ سے وہ عصا عنایت فرمایا جو اس کے منصب کا نشان تھا، اور ایک خریطہ جس میں ایک ہزار اشرفیاں تھیں، اور ایک گھوڑا جس پر بہت تکلف کا سامان

تھا، اس کو دیا اور اجازت دی کہ وہ اپنے قدیم سامان جلوس کے ساتھ شہر میں سوار ہو کر دورہ کرے۔ ترکوں نے صرف یہی نہیں کیا کہ کلیسا کے سب سے بڑے افسر کی وہی عزت اور وقعت قائم رکھی جو اس کو عیسائی شہنشاہان روم کے وقت میں حاصل تھی، بلکہ عدالت کے وسیع اختیارات بھی اس کو دیئے بطریق قسطنطنیہ کی عدالت ایسے کل مقدمات کا جن میں فریقین مسیحی المذہب ہوں فیصلہ کرتی تھی۔ جرمانہ کرنے اور مجرموں کو قید کی سزا دینے کے اختیارات جس کے لیے علیحدہ قید خانے بنے ہوئے تھے اور خاص صورتوں میں سزائے موت کے حکم دینے کا بھی اختیار اس کو حاصل تھا، وزراء سلطنت اور ترکی حکام کو ہدایت تھی کہ اس عدالت کے فیصلوں کی تعمیل کریں۔ سابق عیسوی سلطنت نے رعایا کے مذہبی امور میں طرح طرح کی دست اندازیاں کی تھیں، لیکن ترکوں نے ان میں کچھ دخل نہیں دیا۔ بطریق اور اس کی مذہبی مجلس کو پورے اختیارات مذہب اور مذہبی انتظام کے بارے میں حاصل ہوئے، بطریق مجاز تھا کہ مذہبی مشوروں کی مجلس کو جب چاہے جمع کرے، اور اس کے ذریعہ سے عیسوی فقہ اور اصول کے تمام مسائل کو بغیر سلطنت کی مداخلت کے طے کرے۔ اور چونکہ ایک حیثیت سے وہ سلطانی عہدہ دار بھی تھا، اس لئے اس کے اختیار میں تھا کہ مصیبت زدہ عیسائیوں کی حالت کی اصلاح اس طرح کرے کہ ناانصاف ترکی

گورنروں کے کاموں سے سلطان کو اطلاع کر دے، یونانی اسقف جو اضلاع میں تھے، ان کی بھی بہت عزت تھی اور عدالت کے اختیارات ان کو اس قدر دیے گئے تھے کہ موجودہ زمانے تک انہوں نے اپنے علاقوں میں عیسائیوں پر ترکی حاکموں کی طرح حکومت رکھی ہے[1]۔"

لارڈ ایورسلے کو بھی تسلیم ہے کہ سلطان محمد کی یہ عظیم الشان رواداری اس عہد کی مسیحی یورپین حکومت کی سیاسی اخلاقیات سے بہت آگے تھی، اہل سپین نے ان مسلمان موروں کو جنہوں نے اپنے گرفتار کرنے والوں (عیسائیوں) کا مذہب اختیار کرنے سے انکار کر دیا تھا، ان کے ملک سے نکالتے وقت اس کے توڑنے پر عمل کیا...... یونانیوں یا قسطنطنیہ کے دوسرے باشندوں کو ترغیب یا جبر سے مسلمان بنانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی[2]۔"

اب سلطان محمد کی ایک اور فرد جرم کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ ایک بڑا سنگین الزام اس پر عائد کیا جاتا ہے کہ وہ آسانی سے کیے ہوئے وعدے اور عہد توڑ دیا کرتا تھا، معاہدوں کی اس کی نظر میں کوئی وقعت نہ تھی، پیمان صرف اس لیے تھے کہ توڑ دیے جائیں۔ اسی طرح گرینڈ ڈیوک نوٹاراس پر مظالم کی داستان خوں فشاں بیان کی جاتی ہے۔

---

[1] دعوت اسلام (ترجمہ اردو) ص ۱۴۴،۱۴۵ [2] ایورسلے ص ۸۹

یہ ٹھیک ہے کہ محمد نے نقضِ عہد بھی اپنے طویل دورِ حکومت میں کیا، لیکن اس کے نفسیاتی اسباب و عوامل پر بھی نظر رکھنی ضروری ہے۔

لارڈ ایورسلے محمد کی سنگدلی اور نقضِ عہد کے متعدد واقعات بیان کرنے کے بعد آخر میں لکھتا ہے۔

"محمد کے مظالم اور وعدہ خلافیوں پر ایک بلند معیار کے لحاظ سے رائے قائم کرنا شائد قرینِ انصاف نہیں ہے۔ اس کے دشمن یعنی ان ملکوں کے فرماں روا جن پر اس نے چڑھائی کی اور جنہیں اس نے فتح کیا، ان باتوں میں اکثر اس سے کم نہ تھے۔ سکندر بیگ جس کو البانیا کی وطن پرستانہ مدافعت کے صلے میں اپنے ملک کے اندر ایک ولی کی شہرت اور تاریخ میں ایک بلند مقام حاصل ہوا جب کبھی اس کو موقع ملتا، حد درجہ سفاک اور انتقام جو ثابت ہوتا وہ جنگ کے قیدیوں کو عادۃً قتل کرا دیتا تھا۔ اس معاملہ میں مولڈیویا کے دونوں حکمران بھی پیچھے نہ تھے ولاچیا کا فرماں روا جس کا نام ولاد تھا تاریخ کے شدید ترین ظالم اور خون خوار بدمعاشوں میں سے تھا، وہ "امپیلر" IMPALER یعنی جسم میں میخیں ٹھونک کر ہلاک کرنے والا مشہور تھا، اسے ان قیدیوں اور دوسرے مظلوموں کی، جنہیں وہ اس ظالمانہ طریقے سے قتل کرتا، مرتے وقت کی اذیت اور تڑپ دیکھنے میں خاص لطف آتا تھا، وہ اس غرض سے اس کی ضیافتوں کی رونق کے لئے محفوظ رکھے جاتے تھے، ایک بار جب کسی مہمان نے اس بات پر تعجب ظاہر کیا کہ وہ ایسی

موت سے مرنے والے کے جسم کی بو کیسے برداشت کرتا ہے، تو اس نے اس مہمان کو فوراً سولی پر چڑھا دیا، اور حکم دیا کہ سولی کا کھمبا دوسروں سے زیادہ بلند رکھا جائے تاکہ جس بو کی مہمان نے شکایت کی ہے، اس کی تکلیف اسے نہ پہنچے۔[1]

اشتعال یا انتقام کے موقع پر سلطان محمد ثانی نے جو کچھ بھی کیا ہو تاہم اس کی فطرت، نرم و لطیف جذبات سے محروم نہ تھی، قسطنطنیہ کی فتح کے روز اس نے جس رحم دلی اور رقیق القلبی کا ثبوت دیا، اس کی مثال اس کے کسی ہمعصر نے کبھی پیش نہ کی، ڈیوک نوٹاراس جو افواج قسطنطنیہ کا سپہ سالار اعظم تھا، جب گرفتار کر کے اس کے سامنے لایا گیا تو سلطان محمد نے نہ صرف اسے معاف کر دیا، بلکہ اپنی سرپرستی کا بھی یقین دلایا، اس نے ڈیوک کے ساتھ یہاں تک نوازش کی کہ اس کی بیوی کی عیادت کے لیے گیا، جو علالت اور تازہ مصیبت کے غم سے پریشان تھی اور نہایت نرمی اور احترام کے ساتھ جس طرح کوئی لڑکا اپنی ماں کو سمجھائے اسے تسلی و تشفی دی، اسی نرمی کا برتاؤ اس نے حکومت کے بڑے بڑے افسروں کے ساتھ بھی کیا، اور ان میں سے کتنی ایک کا زرفدیہ اس نے خود ادا کیا، چند ہی دنوں میں اس کے عفو و کرم کا دامن تمام باشندگان شہر تک دراز ہو گیا۔[2]

مگر جلد ہی دامن خون کے دھبے سے داغدار نظر آنے لگا، نوٹاراس اور اس کے لڑکوں کے قتل کا واقعہ عیسائی مورخوں نے سلطان محمد کے نقض عہد

---

[1] ایضاً ص ۱۹۸ [2] گبن جلد ۴ ص ۵۰۱، ۵۰۲ دولت عثمانیہ

سنگدلی اور نفس پرستی کی ایک بین مثال کے طور پر لکھا ہے، اور دل کھول کر اسے برا بھلا کہا ہے لیکن گبن کی تحقیق نے حقیقت کو بے نقاب کر دیا ہے، اور ایک بازنطینی مورخ کی حق گوئی سے بہتان کی یہ پوری عمارت جو بغض و عناد کی بنیاد پر قائم تھی مسمار ہو گئی ہے، عیسائی مورخین ڈیوک اور اس کے لڑکوں کو شہادت کا درجہ دیتے ہیں اور قتل کا سبب یہ قرار دیتے ہیں کہ اس نے اپنے لڑکوں کو سلطان کی خلوت عیش میں بھیجنے سے انکار کر دیا تھا، لیکن واقعہ یہ تھا کہ یہ قتل ایک سازش کا نتیجہ تھا جو نوٹاراس قسطنطنیہ کی آزادی کے لئے اٹلی سے کر رہا تھا، گبن لکھتا ہے کہ "ایسی باغیانہ سازش قابل ستائش ہو سکتی ہے، لیکن جو باغی دلیرانہ جرأت کرتا ہے وہ اس کی پاداش میں اپنی جان کے حق سے بجا طور پر محروم ہو جاتا ہے اور اگر کوئی فاتح اپنے دشمنوں کو قتل کر دے، جن پر آئندہ وہ اعتبار نہیں کر سکتا تو ہمیں اس کو قابل الزام نہ قرار دینا چاہیئے۔"

فرانزا کا معاملہ بھی ایسا ہی تھا جیسا گرینڈ ڈیوک کا واقعہ یہ ہے کہ سلطان محمد کی جگہ جو فرماں روا بھی ہوتا، وہی کرتا جو اس نے کیا۔

سلطان محمد کی سفاکی خون آشامی اور درندہ خوئی کے بارے میں بھی بہت کچھ کہا گیا ہے، اور اس میں شبہ نہیں وہ سخت مزاج تھا، دشمن کے ساتھ کسی طرح کی رعایت نہیں کرتا تھا، لیکن اس کا ماحول کیا تھا، اسے بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیئے۔

قسطنطنیہ میں داخل ہونے کے بعد ترکوں نے جو کچھ کیا وہ تاریخ کا کوئی غیر معمولی واقعہ نہ تھا، قرون وسطیٰ کے دستور جنگ میں مفتوحین کی جان و مال تمام تر فاتح کی ملک ہوتی تھی، جس پر اسے ہر طرح کا اختیار ہوتا تھا، یورپ کی سلطنتوں نے اس اختیار کے استعمال میں کبھی کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا، اور ظلم و تعدی کی ایسی ہولناک مثالیں پیش کیں جو تخیل میں بھی مشکل آسکتی ہیں، جب کبھی انہوں نے مسلمانوں پر فتح پائی وہ سب کچھ کر ڈالا جو تاریخ مظالم کے روشن ترین کارناموں میں شمار کیا جا سکتا ہے، اس کے مقابلہ میں ترکوں نے قسطنطنیہ میں داخل ہو کر جو کچھ کیا وہ حقیقتہً کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتا، بلاشبہ شروع شروع میں جو بھی سامنے آیا، اس کو قتل کر دیا۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ عیسائیوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور مدافعت کی قوت ان میں باقی نہیں رہی، تو فوراً اپنی تلواریں نیام میں کر لیں، اور مال غنیمت کے جمع کرنے میں مصروف ہو گیے، یہ سلسلہ تین روز تک جاری رہا، چوتھے روز سلطان نے امن عام کا اعلان کیا، اور سپاہیوں کے ہاتھ دفعتہً رک گیے، اس موقع پر ایورسلے لکھتا ہے۔ ” اگرچہ سلطان اور اس کے سپاہیوں نے مظالم کیے اور یونانیوں کی پوری جماعت پر نہایت سخت مصیبت ٹوٹ پڑی، تاہم یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فتح قسطنطنیہ کے موقع پر ویسی نفرت انگیز بدمستیوں کا مظاہرہ ہوا، جیسی ۱۲۰۴ء میں دیکھی گئی تھیں۔

جب کہ محاربین صلیبی نے اس پر قبضہ کیا تھا، داخلہ کے ابتدائی چند گھنٹوں کے بعد اس موقع پر کوئی قتل عام نہیں ہوا، آتش زنی بھی زیادہ نہیں ہوئی سلطان نے گرجاؤں اور دوسری عمارتوں کو محفوظ رکھنے کی پوری کوشش کی، اور وہ اس میں کامیاب رہا۔[1]

فاضل مصنف کو اس بات پر بڑا دکھ ہے کہ یورپ نے شہنشاہ قسطنطنیہ کی مدد نہیں کی، بلکہ اس کی اپیلوں کے جواب میں سرد مہری کا رویہ اختیار کیا۔ کوئی شبہ نہیں امر واقعہ یہی ہے، لیکن ایسا کیوں تھا؟ اس کا سبب بھی معلوم کرنا چاہیے۔

"بعض مورخین کا خیال ہے کہ قسطنطین کے معاملے سے یورپ کو زیادہ دلچسپی نہیں تھی، مگر ہمارے نزدیک عیسائی سلطنتوں کے اس طرز عمل کا باعث کچھ اور ہی تھا، گذشتہ ۶۵ سال کے اندر ترکوں کو یورپ سے خارج کر دینے کی غرض سے انہوں نے چار مرتبہ مذہبی اتحاد کے ذریعہ اپنی تمام قوتوں کو یکجا کیا، لیکن ہر بار انہیں ہزیمت اٹھانی پڑی، اور مسیحی اتحاد کا شیرازہ بند ھ بند ھ کر منتشر ہوتا رہا، کسووا (۱۳۸۹ء) نائکوپولس (۱۳۹۶ء) وارنا (۱۴۴۴ء) اور کسووا (۱۴۴۸ء) کی تباہ کن شکستیں اتنی تازہ تھیں کہ یورپ اس قسم کے کسی مزید تجربے کے لئے تیار نہ تھا، اور باوجود اس کے کہ

---

[1] لارڈ ایورسلے صہ ۸۵

قسطنطین نے اپنا اور اپنی سلطنت کا مذہب تبدیل کر کے کلیسائے روما کی اطاعت قبول کر لی اور وہ کر ڈالا جو صدیوں کی کوشش کے بعد بھی مغربی یورپ کی تمام توپیں انجام نہ دے سکیں تھیں، یورپ کے جمود میں کوئی محسوس حرکت پیدا نہ ہوئی اور قسطنطنیہ کی دیواروں کو آخر کار سلطان محمد فاتح کے سامنے سرنگوں ہونا پڑا [1]

اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سلاطین ترک عام طور پہ قسطنطنیہ کو فتح کرنے کی آرزو رکھتے تھے لیکن ایک دوسری حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا، وہ یہ کہ سلطان محمد کو مشتعل کرنے اور اس قدر جلد آمادہ یلغار و یورش کرنے میں خود پالیولوگس شہنشاہ قسطنطین کا بہت بڑا حصہ تھا۔

"سلطان محمد کی تخت نشینی سے تین سال قبل بازنطینی سلطنت کا آخری فرماں روا قسطنطین یازدہم قسطنطنیہ کے تخت پہ بیٹھ چکا تھا، قسطنطین ایک بہادر شہزادہ تھا، لیکن محمد کو برافروختہ کرنے میں اس نے ایسی شدید غلطی کا ارتکاب کیا، جس کا خمیازہ اس کے بیشتر دینوں کو مراد ثانی کے ہاتھوں بھگتنا پڑا تھا، سلطان بایزید یلدرم کا پوتا اورخان نامی جو شہزادہ سلیمان کی اولاد سے تھا، قسطنطنیہ میں نظر بند تھا، اس کے مصارف سلطان کی طرف سے ادا ہوتے

[1] دولت عثمانیہ

تھے۔ قسطنطین نے اس رقم میں اضافے کا مطالبہ کیا، اور عدم منظوری کی صورت میں اُورخان کو محمد کے مقابل کھڑا کر دینے کی دھمکی دی، اسے معلوم نہ تھا، اکیس ہی سال کی عمر میں ارادہ کی پختگی، فوجی قابلیت اور ملکی تنظیم و تدبیر میں اپنے پیشروؤں کا حلیف بن چکا تھا، محمد اس وقت ایشیائے کوچک کی شورشوں کے فرو کرنے میں مصروف تھا، اس نے بازنطینی سفراء کو نرمی کے ساتھ جواب دے کر ٹال دیا۔"[1]

اگر شہنشاہ نے یہ رویہ محمد کے ساتھ نہ اختیار کیا ہوتا تو شاید قسطنطنیہ اس قدر جلد فتح نہ ہوتا!

فتح قسطنطنیہ پر مورخین نے جو مرثیے لکھے اور مسیحی دنیا میں نالۂ رشیون کا جو سلسلہ شروع ہوا، وہ اپنی جگہ ایک حقیقت ہے، اس کی اہمیت گھٹانا ہرگز مقصود نہیں، لیکن ایک مورخ کی طرح جذبات و تعصب سے ذرا دیر کے لیے الگ ہو کر اس فتح کے نتائج و ثمرات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا یہ بہت سے فوائد و نتائج کی حامل تھی۔

تاریخ عالم میں بہت کم ایسے فتوحات نکلیں گے جن کے نتائج اس قدر عالمگیر ہوئے ہوں، جیسے اس عظیم الشان فتح کے جسے آل عثمان کی تلوار نے اس کے اوراق پر منقوش کیا، قسطنطنیہ کی تسخیر نے نہایت قلیل عرصے کے اندر وہ اسباب

---

[1] تاریخ دولت عثمانیہ

پیدا کیے جنہوں نے دنیا کو ہزاروں انقلاب دکھائے، ترکوں کی گونج سے جب یورپ کی سرزمین تھرا اٹھی، تو بچی کھچی آزاد قومیں اپنی سلامتی کے لئے کانپنے لگیں، مگر ان کی مجموعی یاس نے ایک ایسی قوت کا تخم بویا، جس نے آئندہ ہزاروں بگڑی ہوئی قوموں کو سنوارا، گویا جہالت کی تاریکی توہمات کی پرستش اور ایک عام غفلت کا پردہ جو یورپ کے براعظم کو ڈھانپے ہوئے تھا، اسے سلطان محمد فاتح نے اپنی تلوار کی نوک سے ہٹا دیا، کیونکہ اس سے پیشتر ارسطو، افلاطون، سقراط اور بقراط، جالینوس اور ہومر کے علمی خزانے یونانیوں سے قیصروں کے دار الحکومت میں مدفون تھے، ان کی نہ تو دنیا کو خبر تھی، اور نہ ان تک رسائی، صدیوں کے بعد ترکوں کے عروج نے جو جدید واقعات پیدا کیے، انہوں نے ان علمی خزانوں کو دنیا کے سامنے پیش کر دیا اس اشاعت میں ترکوں کی علم ناقدر دانی اور مفتوحین کی ہجرت [illegible]ں سے مساعد کی بالیسی جو کتب خانے یونانیوں اور رومیوں کی سنک[illegible]ں نے صدیوں کی محنتوں سے فراہم کیے تھے، ان کا ایک بڑا حصہ [illegible] ترکوں کے ہاتھ سے فروخت ہو کر دنیا کو ملا، اور جو کچھ فاتحین کی [illegible] سے بچ رہا، وہ مہاجرین کے ساتھ اطالیہ پہنچا جن کی سراسیمگی نے [illegible] وطن چھوڑنے پر مجبور کیا، ان نایاب تصانیف کا وہاں پہنچنا تھا کہ [illegible] یورپ گروہ کی آنکھیں کھل گئیں، اور ان کو رفتہ رفتہ یہ معلوم ہو گیا کہ پاپائے روم کی بتلائی ہوئی محدود نعمتوں کے علاوہ پروردگار عالم نے بہت [illegible]یں انسان کے لئے پیدا کر رکھی ہیں جن کے حصول میں خدا ان نفس کی [illegible] کی ضرورت ہے جن کی تلقین

خدا کے ایک جلیل القدر پیغمبر سے منسوب کی جاتی ہے، نہ اس کو راز تقلید کی جس کا موضوع بنا ابن مریم کے خلفائے اپنی میراث سمجھ لیا تھا۔ غرض انسان کے جسمانی روحانی آرام اور خوشی کے لاکھوں سامان ان کو نظر آئے، اور اب انہیں کی طرف ایک عالم جھک پڑا۔

سب سے بڑھ کر نتیجہ خیز انقلاب جو پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ ایک ایسی جماعت عالم وجود میں آگئی جو انجیل اور تاج میں تمیز کرنے لگی، اس انقلاب نے ایک طرف تو پاپائے روم کے اقتدار کو مسلوب کر دیا، اور دوسری طرف حکومت روم کا وہ دہشت انگیز اور مرعوب کن نام جس نے ہزاروں قوموں کو مفلوج کر رکھا تھا، محو کر دیا، پھر تو ایک ایک ملت سیاسی حیات کے پردے پر ابھر آئی، کیونکہ اگرچہ رومۃ الکبریٰ کا چراغ مدتوں سے ٹمٹما رہا تھا پھر بھی اس کی عظمت رفتہ کے نام میں وہ رعب تھا کہ اقوام یورپ ہمیشہ اپنے کو اسکی خیالی حکومت کا محکوم اور رکن سمجھا کیے، ترکوں کی تسخیر قسطنطنیہ نے اس نام سے یورپ کے کانوں کو ناآشنا کر دیا، جس سے یکایک انہیں ایک خاص قسم کی آزادی محسوس ہونے لگی، اس نئے احساس نے نہ صرف مختلف سلطنتیں قائم کر دیں، بلکہ ان کو توڑ بھی دیا جو مختلف قوموں سے قائم تھیں، اس کی وجہ یہ تھی کہ ہر قوم میں قومی سلطنت کی امنگیں پیدا ہو گئیں اس لیے سیاسیات کا پرانا انتظام قائم رہنا ممکن نہ تھا۔

علاوہ ان سیاسی نتائج کے سب سے فائدہ بخش اسباب جو قسطنطنیہ میں ترکوں کے نصب ہونے سے پیدا ہوئے، وہ تجارت اور سائنس کے متعلق تھے ترکوں کا قسطنطنیہ پر مسلط ہونا تھا کہ یورپ اور ہندوستان

کے مابین آمد و رفت کا پرانا تجارتی رستہ جو گنتی کی چند قوموں کو معلوم تھا، بالکل مسدود ہو گیا۔ اس اہم واقعہ نے یورپ کی قدیم تجارتی قوموں کو جنہیں ہندوستان کی دولت کی قدر معلوم تھی، اس زرخیز خطۂ زمین کی کوئی نئی راہ تلاش کرنے کو بحر الکاہل پر جہاز روانہ کرنے پر مجبور کیا۔ اور یوں ہسپانیہ کی حمایت میں کولمبس سفر کر کے بھٹکتا ہوا امریکہ پہنچا، اور دنیا کو ایک نئی دنیا ملی۔ پھر ایک اور پرتگالی جہاز راں واسکوڈی گاما افریقہ کی جنوب سے چکر کھاتا ہوا ہندوستان پہنچا اور یورپ کے لیے ہندوستان کی ایک نئی اور نسبتہً محفوظ راہ نکال لی۔ ان کے بعد کئی اور قومیں ہندوستان میں آئیں جن میں انگریز فرانسیسی، ڈچ اور ڈنمارک والے تھے۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ سمندر کی جانب سے اجنبی حملہ آور اس میں داخل ہوئے۔ اور یہاں سکندر اعظم سے لیکر درانی کشور کشاؤں کے زمانے تک ہندوستان کے محافظین یہاں کے مشرقی اور مغربی سمندر ہمیشہ ہمالیہ کے ہم پایہ سمجھے گئے۔ ان فرنگی اقوام کی آمد نے یہ ثابت کر دیا کہ یورپ کے مقابلے میں غیر محفوظ رہی، بحری رستے ہیں جنکو اولین تے عبور کیا تھا اور درۂ خیبر وغیرہ کی اہمیت ایک گونہ گھٹ گئی۔ ان اجنبی قوموں خصوصاً انگریزوں اور فرانسیسیوں میں ہوس ملک گیری کے باعث رفتہ رفتہ جنگ چھڑ گئی جنکی باہمی جد و جہد آخر برطانیہ کے سر پر ہندوستان کی حکومت کا سہرا باندھا۔ اسی طرح ترکوں کی فتح قسطنطنیہ نے اگر ایک طرف روم کی عظمت دیرینہ کو خاک میں ملا دیا تھا تو دوسری طرف ایک اور عظیم الشان سلطنت کی بناء کا باعث ہوئی تھی، جو اس حکومت سے کسی بات میں کم نہیں ہے۔

جب ان علوم قدیمہ کو جو سینکڑوں برس سے قیصروں کے دار الحکومت میں دنیا سے چھپے پڑے تھے، واقعات نے پھر بنی آدم کے آغوش میں دے دیا تو وہ ناشاد طبیعتیں جو پادریوں کے وعظ و تلقین سے بیزار تھیں ایسے سامان کی مالک ہو گئیں جو انہیں رہبانیت کی حکومت سے آزاد [illegible] سکے

تھے۔ کیونکہ اگرچہ پاپائے روم کی سلطنت کے خلاف بہتیری معرکہ آرائیاں پہلے بھی ہو چکی تھیں مگر انکا نتیجہ سوا گھٹن بڑھنے کے کچھ نہ ہوا تھا اسکی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ مخالفین کے سامان جنگ میں عقلیت کے وہ اسلحہ موجود نہ تھے جو اِداد کو دمساز بنانے کی تنہا قدرت رکھتے ہیں اب انکے ہاتھ میں یہ زبردست آلہ آگیا تھا یعنی افکار کا وہ نظام جو حق کو باطل سے ممتاز کر کے انسان کے دلوں پر نقش کر دیتا ہے، انکی قوت کے اس اضافے نے انکی جمعیت کو بڑھا دیا، اور مسیح کی خلافت میں جو صدیوں سے روم میں اپنا سکہ جمائے ہوئے تھی تزلزل ڈال دیا کسی طاقت کی اب یہ مجال نہ رہی کہ انکی پیش قدمی کی مزاحمت کرے۔ قتل اور خون ریزیاں عقبی کی جانے لگیں ایک سے ایک سر پھرا پیدا ہوتا گیا جسکے امام اعظم مارٹن لوتھر تھے جنہوں نے دنیا کو ایک نئے مذہب کی تعلیم دی

انہیں اسباب نے ان معاملات کی نفتیشوں کو بھی ممکن کیا جنکی عقدہ کشائی کی کوششوں میں ہیپاتیہ گلیلیو جیسے محقق اور حکیم نے جان گنوائی اور خدا معلوم کتنی قیمتی زندگیوں کا خاتمہ ہو گیا مگر دنیا کب اسکی پرواہ کرتی ہے، کہ کشتہ نامرادوں نے دم توڑا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ انسان آج ہوا پر پرواز کر رہا ہے، اور بحر و بر دونوں پر اسکی حکومت ہے

مورخین یورپ نے قرون وسطیٰ کے اس عہد کا نام نشاۃ ثانیہ رکھا ہے جس [illegible] عام بیداری نے پیدا ہو کر علوم و فنون کو ایک نئی زندگی بخشی تھی، اس عصر حیات [illegible] کی تحریک انہیں علوم قدیمہ کی اشاعت تھی جو ترکوں کی فتح قسطنطنیہ کے بعد مغرب [illegible] اٹلی پہنچے تھے انہیں کی بدولت خدا کی مخلوق اس تمدن اور تہذیب کے [illegible] پر شائع ہوئی جو قدیم یونان نے پیدا کی تھیں اور جن پر صدیوں کی جہالت نے پردہ ڈال رکھا تھا، فلسفہ نے پھر سرسبزی حاصل کی، علم سیاسیات، علم الاقتصاد، علم معاشرت، [illegible] سنگتراشی عالم وجود میں آ گئے۔

ان علوم کی لذتوں نے لوگوں کے دلوں میں بھی اشاعت علم کا ایک عام اشتیاق پیدا کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان کے دماغ نے [illegible] ایجاد کیا جس نے دنیا کی کایا پلٹ دی اور علم و حکمت کی روشنی سے دور دور کے خطوں کو منور کر دیا ہے

کتابیں ہی کتابیں

ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی دو کتابیں

قواعد اُردو — اُردو کے مزاج اور قواعد زبان پر بابائے اُردو مولوی عبدالحق بالقابہ کی نگارشات قولِ فیصل کا درجہ رکھتی ہے۔ قواعد اردو ہماری زبان کی پہلی مستند اور سائنٹفک گرامر ہے۔ اس کا یہ خاص ایڈیشن بعد نظر ثانی ان کی ذاتی نگرانی میں شائع ہوا ہے

مجلد قیمت ۵/

انتخاب کلام میر — فدائے سخن میر کے معتقدین کا حلقہ اب تک بہت وسیع ہے لیکن بیس پچیس برس ادھر ان کی خوبیوں پر فقط چند خواص کی نظر تھی۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق مدظلہ نے اپنے اس انتخاب اور دیباچے کے ذریعے ادب کے تمام طالب علموں کو دنیائے میر کی رنگارنگی سے روشناس کیا اور میر کے مطالعے کی بنیاد ڈالی۔

اس کتاب کے گذشتہ ایڈیشن کتابت کی غلطیوں سے بھرپور تھے۔ اب نظر ثانی اور تصحیح کے بعد یہ خاص ایڈیشن مجلد شائع کیا ہے۔ قیمت ۵/۵۰

چند مجموعہ نظم

پرچھائیاں — ساحر لدھیانوی

ہمارا ساحر — ہماری

نسل کا مجیلا شاعر ساحر اپنا حیا و شیریں زبانی سے بھی جگاتا ہے۔ آتش بیانی سے بھی۔ پرچھائیاں ساحر کی پہلی طویل نظم ہے۔ آرٹسٹ کی تصاویر بھی ہیں۔

خوبصورت گرد پوش — عمدہ جلد — قیمت صرف ۱/۲۵

گاتا جائے بنجارہ ـــــ ساحر لدھیانوی

گاتا جائے بنجارا ساحر لدھیانوی کے نغمات کا مجموعہ ہے۔ ساحر نے گیت کو ایک نئی زندگی بخشی ہے اور انہی خدمات کے تحت اُسے جون ۱۹۵۸ء کو سال کے بہترین نغمہ نگار کا ایوارڈ بھی دیا گیا تھا۔

قیمت ۳/-

تلخیاں — ساحر لدھیانوی

ساحر لدھیانوی کا پہلا مجموعۂ کلام تلخیاں نئی نظموں اور غزلوں کے اضافے کے ساتھ چھپ کر تیار ہے۔ سفید کاغذ، خوبصورت طباعت ـ سہ رنگا گرد پوش ـ ولائتی کپڑے کی جلد

قیمت ـــــ ۳/-

چاند نگر ـــــ ابنِ انشا کا پہلا مجموعہ

"چاند نگر ۱۹۵۵ء میں چھپی تو ادبی دنیا چونک اٹھی۔ ایک نیا خوشگوار، تازہ لب و لہجہ سنائی دیا۔ شعری زبان کو ایک نئی سمت، ایک نئی شخصیت ملی۔"

ابن انشا مستقبل کا شاعر ہے۔ اس کی آواز میں وہ کس بل موجود ہے جو عہد آفریں شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ دوسرا خوبصورت ایڈیشن ۴/-

دوسرا مجموعہ — جھوٹی باتیں — زیرِ طبع

چینی نظمیں (منظوم ترجمے) ابنِ انشاء

لاہور میں ایک چینی موچی

کی دکان پر ایک جوتا تھا۔ عمدہ، نفیس، ابنِ انشاء نے اسے دیکھا اور پسندیدگی سے کہا۔ "میں اس کا ترجمہ کروں گا۔"

شاید یہ نرا لطیفہ ہو لیکن چین اور چینیات سے ابنِ انشاء کے گہرے شغف کی گواہی دیتا ہے۔ جو لوگ چینی شاعری کی سادگی اور نازکی اور ابنِ انشاء کے طرزِ ادا کی مٹھاس اور رچاؤ کے قدردان ہیں۔ خود جان سکتے ہیں۔ یہ کتاب ایک درشن جھروکا ہے۔ چہار رنگا گرد پوش قیمت ۳/۰

شہرِ آذر —— مصطفیٰ زیدی

"مصطفیٰ زیدی کا کلام ہماری شاعری کی جدید اور قدیم دونوں رسُوم سے اس قدر مختلف ہے کہ اس پر رسمی اصلاحات میں تبصرہ کرنا مشکل ہے۔ زیدی کا شعر ہماری جدید شاعری میں ایک انوکھا، پُراسرار اور دلکش اضافہ ہے۔" فیض احمد فیضؔ

قیمت ۳/۵۰

موج مری صدف صدف —— مصطفیٰ زیدی

مصطفیٰ زیدی اردو کے جہانیاں جہاں شاعر ہیں۔ ۱۹۵۶ء میں جب وہ انگلستان میں تھے۔ انھوں نے ایک چھوٹی کار پر تمام یورپ اور مشرقِ وسطیٰ کا سفر کیا۔ "موج مری صدف صدف" اسی مسافت کی جذباتی روئداد ہے۔ چہار رنگا گرد پوش قیمت ۳/۵۰

اسلامی تاریخی ناول

قسطنطنیہ —— رئیس احمد جعفری۔ فتحِ قسطنطنیہ

رئیس احمد جعفری کا تازہ ترین کارنامہ ہے۔ جس میں قسطنطنیہ کے فتح کی داستان نہایت عمدہ پیرائے میں بیان کی گئی ہے۔ سہ رنگا ہاف ٹون گرد پوش ۵/

اسلام کے غازی یورپ میں۔ رئیس احمد جعفری

اس کتاب میں فاضل مصنف نے یورپ پر عربوں کی فاتحانہ یلغار کے سلسلے میں بڑا مستند اور بے انتہا مواد پیش کیا ہے۔ بڑا سائز قیمت ۶/

ٹام راج سے رام راج تک۔ رئیس احمد جعفری

تاریخ کا یہ باب جو جعفری صاحب نے آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔ اب بھی نایاب ہے اور چند سال بعد تو شاید ناپید ہو جائے گا۔ حالانکہ یہی مواد ہے جو آگے چل کر ماخذ بنے گا۔ اور اسے سامنے رکھ کر تاریخیں لکھی جائیں گی۔ ضرورت ہے کہ اس طرح کا مواد جہاں اور جتنا کچھ بھی ملے محفوظ کر لیا جائے۔ فاضل مصنف کی یہ کوشش اس جذبہ کا نتیجہ ہے۔ بڑا سائز قیمت ۶/

منگول

رئیس احمد جعفری

دنیا کا ظالم ترین فاتح چنگیز خاں منگول بگولے کی طرح اٹھا اور آندھی کی طرح چھا گیا۔ رئیس احمد جعفری کے طرز بیان نے اس میں اور بھی جان ڈال دی ہے۔ سہ رنگا گرد پوش ۵/

صلیبی جنگیں:۔

رئیس احمد جعفری

غازی صلاح الدین ایوبی اور رچرڈ کے درمیان جو جنگیں لڑی گئیں۔

انہیں جناب رئیس احمد جعفری نے دل کش انداز میں قلم بند کیا ہے۔

سہ رنگا گرد پوش ۵/-

مغلِ اعظم — اختر یونس

شہنشاہ اکبر جسے تاریخ میں مغلِ اعظم کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ جہاں اپنے وقت کا تدبر حکمران تھا وہاں نہایت جابر و قاہر بادشاہ تھا۔ اسد اس کے ظلم کا نشانہ اس کا بیٹا سلیم بھی بن گیا۔

انارکلی کی دل خراش داستان، ایک کنیز کی محبت کی کہانی جسے صرف اس لئے دیوار میں چنوا دیا گیا کہ وہ ایک کنیز تھی — ایک عام لڑکی تھی۔

جو میں ایسا جانتی پیت کیے دکھ ہوئے
نگر ڈھنڈورا پیٹتی کہ پریت کرے نہ کوئے

سہ رنگا گرد پوش قیمت ۵/-

ہلاکو خاں — اختر یونس

ہلاکو خاں — تاتاری سردار ہلاکو خاں اپنے چنگیز خاں کی طرح ظالم فاتح تھا۔ اس نے بغداد کی اینٹ سے بجا دی۔

اس تاریخ کے ساتھ ساتھ فاضل مصنف نے ایک دلکش رومان کو اس طرح سمویا ہے کہ آپ اس ناول کو پڑھ کر عش عش کر اٹھیں گے۔

سہ رنگا ہاف ٹون گرد پوش۔ قیمت ۶/-

داراشکوہ — اختر یونس

داراشکوہ — اورنگ زیب کا بھائی داراشکوہ بڑا ہی خود پسند اور خود رائے تھا اور اسے اپنی عقل مندی اور معاملہ فہمی پر اس قدر بھروسہ تھا۔ کہ کبھی کسی کو صلاح مشورہ دینے کی جرأت ہی نہیں ہوتی تھی۔ لیکن اس کی دانشمندی اور معاملہ فہمی ہی اس کے حق میں زہر قاتل ثابت ہوئی اور وہ اپنے بھائیوں کی سازش سے آگاہ نہ ہو سکا اور گرفتار ہو کر اورنگ زیب کے دربار

میں لے جایا جا رہا تھا تو سارے دہلی میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔
اس تاریخ کے ساتھ فاضل مصنف نے ایک رومان بھی اس طرح سمویا ہے کہ ایک واقعہ شروع کرنے کے بعد ختم کئے بغیر نہیں چھوڑ سکتے۔ ۸/۷۵

رومانی ناول

چاند ـــــ ملکہ معین ـــــ ملکہ معین دنیائے ادب کا نیا۔ اور درخشندہ ستارہ ہیں جس نے اس ناول میں بے شمار گھریلو گتھیاں سلجھائی ہیں یہ دو سادہ دلوں کی ایسی لاجواب کہانی ہے جسے پڑھ کر آپ داد دئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔ سہ رنگا گرد پوش قیمت ۷/۵۰

دلہن ـــــ محمود ریاض ـــــ ہماری زبان کا سب سے شیریں لفظ، ہمارے دل کی سب سے حسین تمنا، اس ایک نام میں کیا کچھ نہیں۔ حسن، لطافت، شوخی، پیار لیکن یہ منزل بڑی کٹھن ہے اور اس سے پہلے درد، محرومی، مجبوری، حسرت، شکست بھی مرحلے آتے ہیں۔
چل دیئے اٹھ کر سوئے شہر وفا کوئے حبیب پوچھ لینا تھا کسی خاک بسر سے پہلے
قیمت ۵/۰

زلیخا ـــــ محمود ریاض ـــــ یہ بھولے بسرے زمانہ اور دور دراز کے دیس کی زلیخا نہیں۔ ہمارے کوچہ و بازار کی ایک لڑکی جس کی محبت کی مترلیں بے حد کٹھن تھیں۔ ایک حسین اور انوکھی داستان جو درد و نشاط اور ہجر و وصال کی جذبات انگیز کہانی ہے قیمت ۵/۰

بابل ـــــ محمود ریاض۔ بابل جتنا حسین نام ہے اتنا ہی حسین یہ ناول ہے ـــــ محمود ریاض نے آج تک جتنے ناول لکھے ہیں۔ ان

کا یہ ناول سب سے بازی لے گیا۔ ایک باپ کی قربانیوں، بیٹی کے صبر کی دلخراش داستان۔ سہ رنگا گرد پوش قیمت ۵/.

مراقی —— قیسی رام پوری —— یوں تو قیسی رام پوری نے بیشمار ناول لکھے ہیں۔ مگر ان کے قلم کا جادو ان سب سے سبقت لے گیا ہے عشق و محبت جب سازشوں کے جال میں پھنس جائے تو اور بھی حسین لگتی ہے۔

سہ رنگا گرد پوش قیمت -/۶

اُجالا —— قیسی رام پوری —— قیسی رامپوری کے ناولوں کا سرتاج ناول جو قیسی صاحب کو بے حد عزیز ہے۔ اس ناول میں رومان کے ساتھ ساتھ ملک کی حالت کا بھی جائزہ لیا ہے۔ سہ رنگا گرد پوش ۷/۵۰

مہمان خانہ —— انتصار حسین۔ وہ مصنف کو پہلے ایک تقریب اور پھر ایک مہمان خانہ میں ملی تو فوراً اسے یہ ناول لکھنے کا خیال آیا۔ جتنا پیارا یہ ناول ہے، اسی انداز سے اسے ہم نے شائع بھی کیا ہے آپ اس ناول کو پڑھ کر داد دیئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔

سہ رنگا گرد پوش قیمت ۵/.

دشمن ...... انتصار حسین۔ کسی نے کہا ہے کہ دوست سے دشمن بہتر ہے کیونکہ آدمی کم از کم اس سے ہوشیار تو رہتا ہے۔ اسی انداز کی ایک کہانی ہے جس میں دوستی کے پردے میں دشمنی کے کھیل کھیلے جاتے ہیں۔ سہ رنگا گرد پوش ۵/۵۰

مجبور —— ابن انشاد۔ ایک چراغ آخر شب کی کہانی جو رات بھر صبح کے انتظار میں بہر دل جلتا ہے اور آخری شب خاموش ہو جاتا ہے۔ و لائی پھر بڑے کی جلد

بجھ گئے کتنے چراغ رات جاگ کر السلام اے سحر

سہ رنگا گرد پوش قیمت ۲/۵۰

خطبات مدراس ۔ سید سلیمان ندوی ۔ سیرت نبوی کے مختلف پہلوؤں پر وہ آٹھ خطبے جن کو سید سلیمان ندوی نے اکتوبر اور نومبر ۱۹۲۵ء میں مدراس کے انگریزی مدرسوں کے طالب علموں اور عام مسلمانوں کے سامنے لالی ہال مدراس میں ہفتہ وار دیا

قیمت ۳/۰

رحمتِ عالم ۔ سید سلیمان ندوی ۔

اسلام کا گلدستہ جس دھاگے سے بندھا ہے ۔ وہ رحمت عالم کا وجود مبارک ہے ۔ اس لئے ضرورت ہے کہ اس وجود پاک کے سوانح کا ایک ایک حرف ہر مسلمان کے کان تک پہنچایا جائے ۔ تاکہ یہ رشتہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا جائے مولانا نے اس پاکیزہ مقصد کو نہایت خوشی اسلوبی سے سرانجام دیا ہے ۔

قیمت ۳/۰

توبۃ النصوح ۔ مولوی نذیر احمد دہلوی

مولوی نذیر احمد کی سب سے مشہور اور ممتاز تصنیف ہے ۔ اس کے ذریعے مصنف نے بڑے واضح طور پر اپنا نظریہ حیات بیان کیا ہے ۔

قیمت ۲/۵۰

رستم و سہراب ۔ آغا حشر کاشمیری

آغا حشر کاشمیری ہمارے تمثیلی ادب کا سب سے نمایاں نام ہے اور رستم و سہراب آغا حشر کی پرشکوہ الفاظ پر قدرت کاملہ کا مظاہرہ کرتا ہے ۔ اردو کا کوئی ادب پارہ بھی رستم و سہراب کی برابری نہیں کر سکتا ۔

قیمت ۱/۵۰

لاہور اکیڈمی ۔ لاہور

مطبوعات فرنکلن پبلیکیشنز

بچوں کے لئے

دلچسپ اور مفید سائنسی معلومات کی کتابوں کا سلسلہ

(یہ سب کتابیں خوبصورت تصاویر سے مزین ہیں)

آنکھوں سے کام لیجئے	ترجمہ محمد سعید	۱/۵۰
آواز کی کہانی	ترجمہ مسعود احمد خاں	۱/۲۵
بچوں کیلئے سائنسی تحقیق کی راہیں	ترجمہ محمد فاروق	۲/۵۰
تمہارا جسم کیونکر کام کرتا ہے	ترجمہ خلیق ابراہیم خلیق	۴/۵۰
ریڈیو اور ٹیلی ویژن	ترجمہ سید ذوالفقار علی بخاری	۴/۵۰
حیوانی زندگی کا ماضی و حال	ترجمہ ڈاکٹر نذیر احمد	۵/۰
دنیا پر پہلی نظر	ترجمہ سیدہ نسیم ہمدانی	۱/۵۰
زمین کی سرگذشت	ترجمہ سید علی ناصر زیدی	۴/۰
سائنس باتوں باتوں میں	ترجمہ " "	۴/۰
سائنس کے نئے افق	ترجمہ " "	۵/۰
ستاروں کی دنیا	ترجمہ " "	۵/۰
سائنس کی حیرت انگیز باتیں	ترجمہ " "	۲/۵۰
عجائبات کیمیا	ترجمہ محمد فاروق	۴/۵۰
سمندروں کی دنیا	ترجمہ ڈاکٹر نذیر احمد	۴/۵۰
کیمیا کے روحان	ترجمہ پروفیسر حمید عسکری	۵/۰

موسم کی کہانی	ترجمہ بشیر احمد ڈار	۴/۵۰
مشہور مہمات سائنس	ترجمہ محمد فاروق	۲/۵۰
میرے اندر کیا ہے	ترجمہ مولانا غلام رسول مہر	۱/۵۰

بنیادی سائنس کا سلسلہ

(بہترین آفسٹ طباعت ⋆ رنگا رنگ تصاویر)

(مطبوعہ ایران)

انسانی مشین	ترجمہ مولانا صلاح الدین احمد	۱/۵۰
آواز	" " "	۱/۵۰
پرندے	" " "	۱/۵۰
پھول، پھل اور بیج	" " "	۱/۵۰
چاند	" " "	۱/۵۰
حرارت	" " "	۱/۵۰
روشنی	" " "	۱/۵۰
زندہ اشیاء	" " "	۱/۵۰
ستاروں سے آگے	" " "	۱/۵۰
کشش ثقل	" " "	۱/۵۰
کیڑوں کی سماجی زندگی	" " "	۱/۵۰
مٹی	" " "	۱/۵۰
مشینیں		۱/۵۰
مقناطیس		۱/۵۰
موسم		۱/۵۰

K. P. T. Primary School
No..............
Date..........
WEST WHARF.

فنی معلومات

(ذیل کی کتابیں بھی رنگین تصویروں سے مزین ہیں۔)

بجلی کی پہلی کتاب	ترجمہ سید علی ناصر زیدی	۲/۵۰
ٹیلیفون کیسے کام کرتا ہے	ترجمہ خلیق ابراہیم خلیق	۱/۲۵
خلاء میں سفر کی پہلی کتاب	ترجمہ مولانا غلام رسول مہر	۲/۵۰
طیاروں کی پہلی کتاب	ترجمہ 〃 〃 〃	۲/۵۰
موٹروں کی پہلی کتاب	ترجمہ 〃 〃 〃	۲/۵۰

تاریخ

تاریخ بھی مزے کی چیز ہے (تصویر دار)	ترجمہ مولانا عبدالمجید سالک	۱/۵۰
سو تاریخی واقعات (تصویر دار)	ترجمہ و ترتیب مولانا غلام رسول مہر	۷/۰۰

سوانح

سو بڑے آدمی (تصویر دار)	ترتیب و ترجمہ مولانا عبدالمجید سالک	۵/۰۰
غریب گھر کے جو نامور ہوئے (مصور سرورق)	〃 〃 〃	۴/۰۰
لڑکیاں جو نامور ہوئیں	ترجمہ اختر عزیز احمد	۵/۰۰
مشہور موجد اور ان کی ایجادیں	ترجمہ ابوالحسن نغمی	۲/۷۵

ہماری دیگر مطبوعات

(والدین اور اساتذہ کی رہنما مصور کتابیں)

(یہ سب کتابیں تصویر دار ہیں)

آپ کے بچے کی وراثت	ترجمہ شاہد احمد دہلوی	۱/۰۰
بچوں کی بدتمیزیاں	ترجمہ 〃 〃	۱/۰۰

بیماری کے جذباتی اور نفسیاتی پہلو	ترجمہ	شاہد احمد دہلوی	۱/۶۲
اتفاقات جو عظیم طبی کارنامے بن گئے	ترجمہ	ڈاکٹر محمد عبید القوی لقمانی	۵/۰۰

سیاست

اقوام متحدہ	ترجمہ	فضل حق قریشی	۴/۰۰
امریکا کا سیاسی نظام	ترجمہ	مولانا صلاح الدین احمد	۳/۵۰

مذہب و اسلامیات

خدا ہمارے ساتھ ہے	ترجمہ	مولانا صلاح الدین احمد	۱/۲۵
خدا موجود ہے	ترجمہ	پروفیسر عبد الحمید صدیقی	۲/۵۰
اسلام اور قانون جنگ و صلح	ترجمہ	مولانا غلام رسول مہر	۹/۰۰

تعلیم و تعلم

آزاد تعلیم اور جمہوری نصب العین	ترجمہ	سیّد وقار عظیم	۳/۰۰
بچے کی تعلیم میں گھر اور مدرسے کا تعاون	ترجمہ	فضل محمد خاں	۸/۰
تعلیم کے مقاصد	ترجمہ	ڈاکٹر سید عبد اللہ	۵/۵۰
مدرسے کی زندگی میں بچے کی رہنمائی	ترجمہ	سیّد وقار عظیم	۱/۶۲
والدین اور معلمین	ترجمہ	شاہد احمد دہلوی	۱/۵۰

انسانیات

مستقبل کا انسان	ترجمہ	سعید قاسم محمود	۶/۰۰
قدیم تہذیب اور جدید انسان	ترجمہ	-	۳/۵۰
ثقافت کا مسئلہ	ترجمہ	-	۱/۰
قدیم علوم اور جدید تہذیب	ترجمہ	سیّد ہاشمی فرید آبادی	۱/۰

تاریخ

انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم	ترجمہ مولانا غلام رسول مہر	
جلد اول تاریخ اسلام ۱۲/۰ - جلد دوم تاریخ عالم ۱۲/۰ جلد سوم		۱۴/۰
تاتاریوں کی یلغار	ترجمہ عزیز احمد	۱۲/۰
صلیبی جنگیں	ترجمہ سید رئیس احمد جعفری	۵/۰
عرب دنیا	ترجمہ ڈاکٹر محمود حسین	۱۲/۰
کتابیں جنہوں نے دنیا بدل ڈالی	ترجمہ مولانا غلام رسول مہر	۶/۰

سوانح

ایڈیسن	ترجمہ محمود سعید	۳/۵۰
چند عظیم علمائے جراثیم	ترجمہ عبدالمجید قریشی	۱۰/۰
سقراط	ترجمہ آنسہ صبیحہ حسن	۲/۵۰
غازیان تہذیب	ترجمہ سید ہاشمی فرید آبادی	۵/۰
سلطان صلاح الدین ایوبی	ترجمہ پروفیسر محمد یوسف عباسی	۱۷/۵۰
نورمحل	ترجمہ شبلی ایم کام حبیب اشعر دہلوی	۷/۵۰

معاشیات

آبادی کا مسئلہ	ترجمہ شبلی ایم کام	۱/۵۰
خوراک کا مسئلہ	ترجمہ " "	۱/۵۰
علماء کے معاشی نظریات	ترجمہ ڈاکٹر ایس ایم اختر	۶/۰

فلسفہ

داستان فلسفہ	ترجمہ سید عابد علی عابد	۱۴/۰
ناقابل تسخیر ذہن انسانی	ترجمہ محمد صفدر میر	۲/۵۰

فلسفے کی نئی تشکیل	ترجمہ	انتظار حسین	۲/۰

فنون لطیفہ

شاہکار تصاویر	ترجمہ و ترتیب	سید امتیاز علی تاج	۷/۵۰

جغرافیہ اور سیاحت

عرب اور اہل عرب	ترجمہ	مولانا غلام رسول مہر	۶/۰
نیویارک سے پیرس تک پہلی پرواز	ترجمہ	گروپ کیپٹن فیاض محمود	۳/۵۰
یہ ہے شمالی افریقہ	ترجمہ	سید عابد علی عابد	۲/۵۰

ناول ، افسانے ، ڈرامے

انجان راہی	ترجمہ	شان الحق حقی	۳/۵۰
بادبان	ترجمہ	سید قاسم محمود	۶/۰
بشر ہے کیا کہئے	ترجمہ	سید عابد علی عابد	۶/۵۰
پہلا خون	ترجمہ	غلام حسین	۲/۵۰
چنگیز خاں کے سنہرے شاہین	ترجمہ	اشفاق احمد	۶/۰
دھوپ چھاؤں	ترجمہ	ذکی اشرف صبوحی	۷/۰
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے	ترجمہ	سید رئیس احمد جعفری	۴/۵۰
شہر تباہ	ترجمہ	ابن انشاء	۳/۵۰
گھاس کا سمندر	ترجمہ	سید قاسم محمود	۱/۵۰
قیامت کی رات	ترجمہ	سید عابد علی عابد	۷/۰
مغرور	ترجمہ	سید رئیس احمد جعفری	۴/۰
ننھی بی بیاں	ترجمہ	حجاب امتیاز علی	۵/۵۰
نئے پرانے	ترجمہ	محمد یوسف عباسی	۳/۰

ہمیں چراغ ہمیں پروانے	ترجمہ	قرۃ العین حیدر	۱۰/۰
ویران ہے دل	ترجمہ	قیسی رام پوری	۶/۰
اندھا کنواں	ترجمہ	ابن انشا	۷/۵۰
انوکھی کہانیاں	ترجمہ	شاہد احمد دہلوی	۵/۰
بڑا ریچھ	ترجمہ	ولی اشرف صبوحی	۳/۵۰
باپ کی نگری	ترجمہ	سید نسیم احمد دہلوی	۴/۰
قصص الحمراء	ترجمہ	سید وقار عظیم	۷/۵۰
خزانے کی تلاش	ترجمہ	شبلی ایم کام	۲/۵۰
سورج کے ساتھ ساتھ	ترجمہ	عشرت رحمانی	۶/۵۰
لاکھوں کا شہر	ترجمہ	ابن انشا	۳/۵۰
ایک حمام میں	ترجمہ	عشرت رحمانی	۳/۰
پھول کی پتی ہیرے کا جگر	ترجمہ	ہلال احمد زبیری	۶/۰

نئی کتابیں

آدمی کی انسانیت	ترجمہ	مولانا محمد بخش مسلم	۷/۵۰
فلسفے کا نیا آہنگ	ترجمہ	بشیر احمد ڈار	۳/۵۰
کائنات اور ڈاکٹر آئن شٹائن	ترجمہ	میجر آفتاب حسن	۱/۷۵
مشرق و مغرب کو ملنا ہی پڑے گا	ترجمہ	سید ہاشمی فرید آبادی	۱/۷۵
کیا سائنس ہمیں بچا سکتی ہے	ترجمہ	پروفیسر عبدالواحد	۱/۷۵
سورج کی پیدائش اور موت	ترجمہ	فاروق احمد صدیقی	۵/۰
وقت کا آسمان	ترجمہ	ن۔م راشد	۳/۰
تعلیم کا عمل	ترجمہ	سید عابد علی عابد	۲/۵۰

شخصیت کا مطالعہ	ترجمہ	ڈاکٹر عبدالودُود	۱/۷۵
قوت حافظہ	ترجمہ	عبدالحمید صدیقی	۵/۰
اسلام - صراط مستقیم	ترجمہ	غلام رسول مہر	۱۲/۰
بابر (شیر ببر)	ترجمہ	سید ہاشمی فرید آبادی	۶/۷۵
بچے کی جماعتی زندگی	ترجمہ	سید وقار عظیم	۱/۷۵
سائنس کی پہچانس	ترجمہ	ابن انشاء	۱/۰
وہ بیضوی تصویر	ترجمہ	ابن انشاء	۱/۰

فرینکلن پبلی کیشنز

پوسٹ بکس نمبر ۳۶۹ - لاہور